اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری
جذبہ ایثار، حکمت ودانائی
حضرت ابودرداءؓ کی پانچ نصیحتیں
عورتوں کا فتنہ
بدعت کی حقیقت
قرآن سیکھ کر پڑھنے کے فضائل
صوفیاء کے اخلاق
شہادت کی فضیلت اور اقسام
موت کے وقت کے احوال
شاہراہ انسانیت کی روشن قندیلیں

جلد پنجم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

شہیدِ اسلام

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نوّر اللہ مرقدہ

باہتمام : محمد طلحہ طاہر

نبیرہ شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نوّر اللہ مرقدہ

ناشر

مکتبہ لدھیانوی

سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

03212115502

اصلاحی مواعظ

تالیف: شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

ہمارے دادا جان شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ جہاں تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء کے امام تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو وعظ وتقریر اور زبان و بیان کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا،آپؒ کے مواعظ و بیانات نہایت سادہ ،موثر،عام فہم اور مسحور کن ہوتے تھے۔ اندازِ بیان میں ناصحانہ و مشفقانہ رنگ غالب ہوتا،مسلمانوں کی خیرخواہی کے جذبہ سے سرشاراور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے وہ موثر مواعظ و بیانات جن سے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا۔ انہیں کیسٹ میں محفوظ کرلیا گیا تھاجسے بعد میں ڈیجیٹائز کیا گیا۔جو کہ'' شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم پر دستیاب ہیں۔ان میں سے تقریباً ۱۳۵ کیسٹوں سے ۸ ضخیم جلدیں ''اصلاحی مواعظ'' کے نام سے مرتب کی گئیں۔جن میں تخریج کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ پر اعراب کا خاص اہتمام کیا گیاہے۔اس طرح آٹھ جلدوں پر مشتمل یہ خوبصورت گلدستہ تیار ہوگیا ہے جوکہ علماء،طلبا،خطبا،مقررین،واعظین اورعوام الناس کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

حضرت شہیدِ اسلامؒ کی دیگر تصانیف کی طرح ''اصلاحی مواعظ'' (دس جلدوں پر مشتمل اس گلدستے کو بھی '' شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم سے عام کرنے پر ہم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سر بسجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ہمارے اکابر کے علوم و فیوض کو عام فرمائے ، خلقِ خدا کے لیے نافع اور ہمارے اکابرین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔آمین

جن حضرات کی دعاؤں،توجہات اور سرپرستی سے اس اہم کام کی تکمیل ہو پائی،میں ان کا بے حد شکرگزار ہوں،خصوصاً میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد سعید لدھیانوی دامت برکاتہم ،شاہینِ ختمِ نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا دامت برکاتہم اور شیخ ڈاکٹر ولی خان المظفر حفظہ اللہ، جن کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمر میں برکت عطا فرمائے اورصحت و عافیت کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔اسی طرح حافظ محمد طلحہ طاہر(ناظم مکتبہ لدھیانوی) جناب امجد رحیم چوہدری سمیت تمام معاونین کہ جن کا کسی بھی طرح تعاون حاصل رہا،تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا و رضوان سے نوازے۔آمین

محمد الیاس لدھیانوی
بانی ومنتظم ''شہیدِ اسلام پورٹل''

www.shaheedeislam.com

info@shaheedeislam.com

+92 321 9264592

۱۵/۹/۱۴۴۷ھ - ۵/۳/۲۰۲۶ء

نوٹ: Mobile اور iPad وغیرہ میں بہتر طور پر دیکھنے کے لیے Adobe Acrobat کو PDF Reader کے طور پر استعمال کریں۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں میں سے ہر ایک کے ساتھ نرالہ معاملہ ہے، کسی کو شہرت ومقبولیت سے نوازتے ہیں تو کسی کو اخفا اور تواضع کی لذتوں سے سرفراز فرماتے ہیں، اور کچھ حضرات کو تواضع اور اخفا کے ساتھ شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر فائز فرمادیتے ہیں۔

اسی طرح بعض اکابر کو زبان و بیان کی شیرینی سے نوازتے ہیں تو بعض کو تصنیف وتالیف اور تحریر و انشأ کی سروری عطا فرماتے ہیں، اور کچھ خوش نصیبوں کو مجموعۂ کمالات بنادیتے ہیں۔

حضرت اقدس حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہیدؒ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا مصداق بنایا تھا کہ بلاشبہ وہ جامع کمالات تھے۔ آپؒ کو اللہ تعالیٰ نے جہاں قلم کا دھنی، تصنیف و تالیف اور تحریر و انشأ کا بے تاج بادشاہ بنایا تھا، وہاں آپؒ زبان و بیان اور وعظ وتقریر کے میدان میں بھی موتی لٹاتے تھے۔ آپؒ کا ہر بیان از دل خیزد

بردل یزد کے مصداق، جامع، مؤثر اور مسحور کن ہوتا، وہ علم وعمل کے پہاڑ اور بحرِ معرفت کے غواص تھے، اس لئے حضرتؒ کے خدام نے طے کیا کہ حضرتؒ کے مواعظ کو کیسٹ سے نقل کرکے کتابی شکل میں مرتب کیا جائے اور اس کا نفع عام کیا جائے۔ بحمداللہ اس کام کے آغاز کو ابھی تھوڑا عرصہ ہی ہوا ہے کہ اس سلسلہ کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے، جو درج ذیل عنوانات پر مشتمل ہے:

''بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری، مقبولیت کا مدار اخلاص، صوفیأ کے اخلاق، ایثار ومواسات، جذبۂ ایثار، حکمت و دانائی، حضرت ابودرداءؓ کی پانچ نصیحتیں، اعمالِ صالحہ کے عناصر اربعہ، عورتوں کا فتنہ، بدعت کی حقیقت، بدعات پر نکیر، قرآن کریم سیکھ کر پڑھنے کے فضائل، شہادت کی فضیلت و اقسام، دنیا و آخرت کا تقابل، یومِ حساب سے پہلے محاسبہ کی ضرورت، موت کے وقت کے احوال، شاہراہِ انسانیت کی روشن قندیلیں۔''

اللہ تعالیٰ ہمارے رفقأ خصوصاً مولانا محمد اعجاز صاحب، مولانا نعیم امجد سلیمی، بھائی عبداللطیف طاہر اور حافظ عتیق الرحمٰن لدھیانوی کو جزائے خیر دے، جنھوں نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جہدِ مسلسل کی۔

خاکپائے حضرت شہیدؒ
سعید احمد جلال پوری
۱۷/ ۱۲/ ۱۴۲۳ھ

فہرست مقالات

تفصیلی فہرست

بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری

مقبولیت کا مدار اخلاص

صوفیاءؒ کے اخلاق

ایثار ومواسات

جذبۂ ایثار

حکمت و دانائی

حضرت ابودرداءؓ کی پانچ نصیحتیں

اعمالِ صالحہ کے عناصرِ اربعہ

عورتوں کا فتنہ

بدعات پر نکیر

قرآن کریم سیکھ کر پڑھنے کے فضائل

شہادت کی فضیلت و اقسام

دنیا و آخرت کا تقابل

یومِ حساب سے پہلے محاسبہ کی ضرورت

موت کے وقت کے احوال

شاہراہِ انسانیت کی روشن قندیلیں

اکابر کے بعد اصاغر کی ذمہ داری!

نفس اور شیطان سے امن کے لئے اور محفوظ ہونے کے لئے لازمی شرط ہے کہ آدمی کی نکیل کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو، یہ ''شتر بے مہار'' نہ ہو، آدمی کے دین کی حفاظت صرف اسی صورت میں ہے کہ جب اہل اللہ سے اس کا تعلق ہو، اور یہ خودمختار، خودرو نہ ہو، بلکہ کسی کی مان کر چلنے والا ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ کا وصال ہوا، تو حضرتؒ کے خلفاٗ اور متعلقین کا اجتماع ہوا، جس میں بعد والوں کے لئے کام کرنے کے لئے طریقہ کار اور لائحہ عمل متعین کرنے اور کام کرنے کی نوعیت پر مختلف حضرات کے بیانات ہوئے، اس موقع پر حضرت شہیدؒ نے جو کچھ فرمایا وہ ہدیہ ناظرین ہے۔...............سعید احمد جلال پوری

ہمارے اکابرؒ سب کچھ فرما چکے ہیں، انہوں نے کوئی بات باقی نہیں چھوڑی جو عرض کی جائے، حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کی جامعیت اور حضرتؒ کے فضائل و کمالات بیان کرنے کے لئے یہ جلسہ کافی نہیں ہے، اور نہ اس وقت یہ موضوع ہے، اس کی طرف مختلف اشارے ہوچکے ہیں، اس اجلاس کا اصل موضوع حضرت اقدس قدس سرہ کے لئے ایصالِ ثواب ہے، اور وہ ہم ابھی کریں گے، اور ایک بات یہ ہے

کہ جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متبعین ہیں، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے حضرات ہیں، وہ اپنے آپ کو بٹھائیں نہیں بلکہ چلائیں اور اس کے لئے کوئی لائحہ عمل طے کردیا جائے، یہ اس جلسہ کا اصل مقصد تھا، تو ان حضرات یعنی حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب نے یہ دونوں باتیں ارشاد فرمادی ہیں، حضرتؒ سے تعلق رکھنے والے تو ماشاءاللہ بہت ہیں، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول وہ فرماتے ہیں کہ: ''اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کا قصد کرنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور پھر جو قصد رکھتے ہیں، ان میں سے چلنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور جو چلنے لگتے ہیں ان میں سے پہنچنے والے بہت کم لوگ ہیں، اور پہنچنے والے بھی علیٰ خطر عظیم۔'' ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ اس شر و فساد کے زمانے میں ہم موجود ہیں۔

بیعت کی ضرورت:

اس زمانہ میں اہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی مفقود ہوگیا ہے، یعنی اللہ والوں سے تعلق رکھنا چاہئے، یہ بات بھی اب بحث و نظر کا موضوع بن گئی ہے، چاہئے یا نہ چاہئے .... ظاہر ہے کہ جب کسی اللہ کے بندے سے تعلق نہیں ہوگا، اس کے جوتوں کی خاک نہیں بنیں گے، تو اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنا کیسے آئے گا؟ اور پھر اس مرض میں عوام تو بے چارے اپنی غفلت کی وجہ سے مبتلا ہیں ہی، ہمارے علماء، طلبہ اور اچھے اچھے صلحاءٔ بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ قرآن و حدیث موجود ہے، ہم اس پر عمل کرتے رہیں گے، اور جیسا ہم عمل کرتے ہیں، وہ ہمیں معلوم ہے، شیطان یہ دھوکہ دے دیتا ہے کہ قرآن کریم بھی موجود ہے، حدیث بھی موجود ہے، ہم عمل کرتے رہیں گے، لیکن جیسا عمل ہم سے بن پڑتا ہے، وہ مجھے اپنا معلوم ہے اور آپ کو اپنا معلوم ہے، اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔

کسی کے ہاتھ میں نکیل ہونی چاہئے:

نفس اور شیطان سے امن کے لئے اور محفوظ ہونے کے لئے لازمی شرط ہے کہ آدمی کی نکیل کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو، یہ ’’شتر بے مہار‘‘ نہ ہو، میں نے کل حضرت مفتی صاحب (ولی حسن صاحب مدظلہ) سے کسی بزرگ کا مقولہ عرض کیا تھا، وہ فرماتے تھے کہ کسی گدھے کے ہاتھ میں میری نکیل ہو، یہ اس سے بہتر ہے کہ میں بغیر کسی پابندی کے خودمختار، خود رو رہوں، (یعنی اس کے بجائے کہ میں شتر بے مہار رہوں، بہتر ہے کہ کسی حیوان کے ہاتھ میں میری نکیل ہو)، آدمی کے دین کی حفاظت صرف اسی صورت میں ہے کہ جب اہل اللہ سے اس کا تعلق ہو، اور یہ خودمختار، خود رو نہ ہو، بلکہ کسی کی مان کر چلنے والا ہو۔

جو اپنے اکابرؒ کی نہیں مانتے وہ اللہ، رسول کی بھی نہیں مانیں گے:

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہ، ان دوسرے حضرات کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان حضرات نے ہمیں (علمأ دیوبند کو) نہیں پہچانا، تو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا پہچانیں گے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ جو حضرات اپنے اکابرؒ کی مان کر نہیں چل سکتے، وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مان کر کیسے چل سکتے ہیں؟

شجرۂ طوبیٰ نہ رہا:

بلاشبہ حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمہ اللہ اس زمانہ میں شجرۂ طوبیٰ کی مثال رکھتے تھے، جس کی شاخیں مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک پھیلی ہوئی تھیں، دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں تھا جو حضرت کی نظر شفقت اور آپؒ کی توجہات اور آپؒ کی دعاؤں سے محروم ہو، حضرتؒ کا وہ سایہ سمٹ گیا، خدا کو یہی منظور تھا۔

لائحہ عمل مرتب کریں:

اب حضرتؒ کے جتنے بھی زیر سایہ حضرات ہیں ان کو اپنا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیئے کہ ہمیں بیٹھ جانا ہے یا چلنا ہے؟ اور چلنا ہے تو کس طرح چلنا ہے؟

ذکر کا غلبہ چاہیئے!

آپ کو معلوم ہے، جیسا کہ اکابرؒ نے فرمایا کہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو آخری زمانہ میں غلبۂ ذکر تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ ذکر کی لائن بالکل ٹوٹ گئی، الحمد للہ تبلیغ کی لائن بھی اللہ نے تبلیغی جماعت کے ذریعہ سے زندہ کردی، اور اللہ کا شکر ہے کہ مدارس دینیہ کے ذریعہ سے علم کی لائن بھی چل رہی ہے، لیکن ذکر کی لائن بالکل ٹوٹ گئی، حضرت اس کو محسوس فرمارہے تھے۔

چپڑاسی سے شیخ الحدیث سب صاحبِ نسبت:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد ماجد مولانا محمد یٰسین صاحبؒ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ وقت دیکھا جب شیخ الحدیث سے لے کر چپڑاسی تک اور چپڑاسی سے لے کر شیخ الحدیث تک تمام خدام مدرسہ صاحب نسبت ہوتے تھے، اب وہ نسبت والی کیفیت نہیں رہی۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو آخری دور میں ذکر کی لائن کے بارے میں غلبہ حال تھا کہ اس کو کسی طریقہ سے دوبارہ زندہ کیا جائے۔

تعلق کا معنی اتباع:

اہل اللہ سے تعلق کا معنی یہ ہے کہ ان کی ہدایات پر چلنا اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا تاکہ قلب میں اخلاص پیدا ہو، تزکیہ پیدا ہو، اس کے لئے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنا لائحہ عمل مرتب کریں۔

کاملین دوسروں کو فائدہ پہنچائیں:

ایک بات تو یہ عرض کرنے کی ہے کہ جن حضرات کا سلوک مکمل ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نسبت کی یہ دولت عطا فرمادی ہے، وہ دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔

سالکین شتر بے مہار نہ رہیں:

جن کا سلوک ابھی مکمل نہیں ہے اور جو ابھی اس راہ پر چل رہے ہیں ان کو بہرحال رہنمائی کی ضرورت ہے، ہمیں شتر بے مہار نہیں رہنا چاہئے، کسی اللہ کے بندے سے تعلق قائم کرنا چاہئے، الحمد للہ یہاں حضرتؒ سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں، اور دوسرے اکابر بھی موجود ہیں، جس کی طرف بھی طبیعت راغب ہو اس سے تعلق رکھو، تعلق اصل میں حضرت شیخ ہی کا ہے، خود حضرت شیخ بھی ساری عمر اپنی طرف سے بیعت نہیں فرماتے تھے، بلکہ اپنے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بیعت فرماتے تھے، تعلق تو وہی ہے لیکن مقصود پابندی ہے۔

اکابرؒ کے ایصالِ ثواب:

دوسری بات جیسے حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ نے فرمایا کہ یہ ذکر کی لائن جتنی زندہ ہوگی اس کا ایصال ثواب حضرت شیخ رحمہ اللہ کو پہنچے گا، اور ہمارے حضرت شیخ قدس سرہ کے اور کمالات میں سے ایک کمال یہ بھی ہے کہ خود ان کی زندگی میں جتنا ان کو ایصال ثواب کیا گیا ہے، اتنا کسی کو نہیں کیا گیا، ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں حضرتؒ کی طرف سے حج ہوتے تھے، مخلصین حضرتؒ کی طرف سے حج کرتے تھے، ہزاروں کی تعداد میں عمرے ہوتے تھے، نہ معلوم حضرتؒ کی طرف سے ہر سال کتنی قربانیاں ہوتی تھیں اور دوسرے ذکر واذکار کا تو ذکر ہی کیا، حضرت شیخ رحمہ

اللہ ویسے بھی تو بادشاہ تھے۔ حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی قدس سرہ، تبلیغی جماعت والے حضرتؒ کے عزیز اور چچا زاد بھائی بھی تھے، ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ انہوں نے ''حیاۃ الصحابۃ'' کا ایڈیشن چھاپ کر پورا کا پورا حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو ہدیہ کردیا تھا، ''حیاۃ الصحابۃ'' تین جلدوں میں ہے، آج اگر چھاپی جائے تو میرا اندازہ تو یہ ہے کہ کم ازکم ساٹھ ستر ہزار روپیہ چھاپنے کے لئے چاہئیں، اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ جس کو چاہیں دیں، یہ تو مادی ہدیے تھے، اس قسم کے ہدیے حضرت کی زندگی میں حضرت شیخ رحمہ اللہ کے ایصال ثواب کے لئے بہت ہوتے رہتے تھے۔

یہ شکلیں بھی چلتی رہنی چاہئیں، حضرتؒ کے ساتھ جتنا تعلق بڑھے گا، جتنا آپ ایصال ثواب کریں گے اتنا حضرتؒ کی روح پرفتوح بھی انشاءاللہ متوجہ رہے گی اور حضرتؒ کا فیض بھی آپ حضرات کو پہنچتا رہے گا، ایصال ثواب کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں، خواہ ذکر وتسبیح کے طور پر ہوں، قرآن کریم کی تلاوت کے طور پر ہوں، نوافل کے طور پر ہوں، حج وعمرہ کے طور پر ہوں، قربانی کے طور پر ہوں، اور دوسرے صدقات کے طور پر ہوں، جتنی لائنیں بھی ایصالِ ثواب کی ہوسکتی ہیں ان سب کا صرف وقتی نہیں: کہ ایک مجلس قائم کرلی اور ہم نے کچھ قرآن مجید کی تلاوت کرلی اور حضرت شیخ کو ایصال ثواب کردیا، اور بس، نہیں یہ تو ایک مستقل کام ہے اور الحمدللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر ہمارے شیخ رحمہ اللہ تک جتنے اکابرؒ ہیں، سب کو ایصال ثواب کریں گے تو سب سے تعلق قوی ہوگا، یہ لائن یعنی ایصال ثواب والی لائن یہ بھی چلتی رہنی چاہئے، چاہے تھوڑا معمول ہو، چاہے زیادہ، لیکن ہمیشہ کا معمول ہونا چاہئے۔

مقبولیت کا مدار

اخلاص!

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ نیک اولاد بذاتِ خود صدقہ جاریہ ہے، نیک اولاد جتنے نیک کام کرے گی جیسے روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ اکابرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے فرمادیا گیا ہے کہ اولاد کو دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے تو نیک اولاد والدین کے لئے اگر ایصالِ ثواب نہ بھی کرے، تب بھی نیک اولاد نیک عمل ہے، اور یہ جو فرمایا کہ اس کے لئے دعا کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ملے گا ہی والدین کو۔ اولاد کو اپنی طرف سے بھی ایصالِ ثواب کرنا چاہیئے کہ یہ والدین کا حق ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں مزید ارشاد فرمایا:

”وَيَقُوْلُ الرَّجُلُ: قَدْ هَاجَرْتُ وَلَمْ يُهَاجِرْ، وَاِنَّ الْمُهَاجِرِيْنَ هَجَرُوا السَّيِّاٰتِ، وَيَقُوْلُ اَقْوَامٌ جَاهَدْنَا وَاِنَّ الْجِهَادَ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مُجَاهَدَةُ الْعَدُوِّ وَاجْتِنَابُ الْحَرَامِ وَقَدْ يُقَاتِلُ اَقْوَامٌ يُحْسِنُوْنَ الْقِتَالَ، لَا يُرِيْدُوْنَ بِذَالِکَ الْاَجْرَ وَلَا الذِّكْرَ وَاِنَّمَا الْقَتْلُ حَتْفٌ مِنَ الْحُتُوْفِ، وَكُلُّ اِمْرِئٍ عَلٰى مَا قَاتَلَ عَلَيْهِ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيُقَاتِلُ بِطَبِيْعَتِهٖ مِنَ الشَّجَاعَةِ فَيُنَجِّیْ مَنْ يَّعْرِفُ وَمَنْ لَّا يَعْرِفُ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَيَجْبُنُ بِطَبِيْعَتِهٖ فِيُسْلِمُ اَبَاهُ وَاُمَّهٗ وَاِنَّ الْكَلْبَ لَيَهِرُّ مِنْ وَّرَاءِ اَهْلِهٖ، وَاعْلَمُوْا اَنَّ الصَّوْمَ حَرَامٌ يُجْتَنَبُ فِيْهِ اَذٰى الْمُسْلِمِيْنَ كَمَا يَمْنَعُ الرَّجُلَ مِنْ لَذَّتِهٖ مِنَ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَالنِّسَاءِ فَذَالِکَ الصِّيَامُ التَّامُ ...... الخ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۱۳)

ترجمہ:......’’(حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ:) بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم مہاجر ہیں حالانکہ وہ مہاجر نہیں ہیں، مہاجر تو وہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روک دیا ہے ان کو چھوڑ دے (صرف ترکِ وطن کرنے والے کو مہاجر نہیں کہتے) پھر فرمایا کہ بہت سے لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں، ٹھیک ہے کرتے ہوں گے لیکن اللہ کے راستے میں جہاد یہ ہے کہ (محض اللہ کی رضا کے لئے ہو) کہ (دین کے) دشمن سے مقابلہ کرے اور حرام سے اجتناب کرے، اور بہت سے لوگ بہت ہی اچھا قتال کرتے ہیں لیکن اس قتال سے ان کا مقصود ثواب اور اعلائے کلمۃ اللہ نہیں ہوتا قتال تو محض موت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، اور ہر آدمی سے اس کی نیت کے مطابق معاملہ ہوگا، پھر فرمایا کہ بہت سے لوگ اس لئے لڑائی کرتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں لڑائی ہے، پس وہ اس کے ذریعہ ہر آدمی کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں اور بہت سارے لوگ اس لئے تکرار نہیں کر سکتے کہ ان کی طبیعت میں بزدلی ہے، پس وہ اپنے والدین کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، حالانکہ بے شک کتا اپنے گھر والوں کی وجہ سے بھونکتا ہی ہے، بے شک روزہ (کئی چیزوں کو) حرام (کرنے والا) ہے کیونکہ اس میں مسلمانوں کو تکلیف دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے، جیسا کہ روزہ روزہ دار آدمی کو اس کے لذات یعنی کھانے پینے اور عورتوں سے روک دیتا ہے، پس اسی کو مکمل روزہ کہا جاتا ہے۔‘‘

رضائے الٰہی کے لئے لڑنا جہاد ہے:

تو بات یہ ہے کہ کوئی شخص شہرت کے لئے لڑائی کرتا ہے، یا اپنے مزاج کی وجہ سے لڑائی کرتا ہے، یا مزاج ہی لڑاکا پایا ہے تو شریعت نے رخ کافروں کی طرف کردیا، یا کوئی شخص اپنے قبیلے کی حمایت میں لڑتا ہے،کوئی شخص اپنی قوم کی حمایت میں لڑتا ہے، یہ مجاہد نہیں ہے، مجاہد صرف وہ لوگ ہیں جو رضائے الٰہی کے لئے لڑتے ہیں، اور اس پر آخرت کے اجر وثواب کی توقع رکھتے ہیں، دنیا کا کوئی مفاد اور منفعت ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

کامل روزہ:

اس کے بعد فرمایا کہ دیکھو بھائی! روزے میں کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے لیکن کھانا پینا تو پہلے حلال تھا اب روزے کی حالت میں حرام ہوگیا اور مسلمانوں کو ایذا پہنچانا، ان کو تکلیف دینا اور ان کی غیبت کرنا اور ان کی تحقیر کرنا یہ روزے سے پہلے بھی حرام تھا، تو بہت سارے لوگ روزہ رکھتے ہیں، کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں لیکن مسلمانوں کی ایذارسانی کرنا نہیں چھوڑتے، جو کہ حرام ہے جس سے بچنا لازم ہے، ان کی غیبت ترک نہیں کرتے تو ان لوگوں کا روزہ نہیں، جو کھانے پینے کے ساتھ مسلمانوں کی ایذارسانی کو نہ چھوڑ دیں، مسلمانوں کو نقصان پہنچانا خواہ ہاتھ سے ہو، یا زبان سے ہو، یا کسی اور طرز عمل سے ہو، تمہارے وجود سے کسی کو ایذا نہ ہو، فرمایا کہ یہ ہے پکا اور پورا روزہ۔

زکوٰۃ فرائض دین میں سے ہے:

پھر فرمایا کہ زکوٰۃ کا ادا کرنا ان فرائض میں سے ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض فرمایا، زکوٰۃ کا حکم تو قرآن کریم میں ہے لیکن زکوٰۃ کس چیز میں سے کتنی دی جائے اور اس کے شرائط کیا ہیں؟ اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔

زکوٰۃ کی تفصیلات قرآن میں نہیں:

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ ایک موقع پر موجود تھے، کوئی بات ہوئی تو ایک نوجوان کہنے لگا کہ قرآن کریم میں اس کی کیا دلیل ہے؟ غضبناک ہوکر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤ کہ تم جو زکوٰۃ دیتے ہو قرآن کریم میں اس کی مقدار بیان کی گئی ہے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کس مال میں سے دی جائے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کی ادائیگی کی یہ شرط ہے کہ اس مال پر سال گزر جائے؟ یہ بیان کیا گیا ہے کہ فلاں مال کا نصاب یہ ہے؟ اونٹوں کا نصاب یہ ہے، گائے کا نصاب یہ ہے، بکری کا نصاب یہ ہے، پھلوں کا نصاب یہ ہے، فصل کا نصاب یہ ہے، زمین کا نصاب یہ ہے اور جو زمین بارانی ہو اس کا نصاب یہ ہے، نہری زمین کا نصاب یہ ہے، سونے چاندی کا نصاب یہ ہے، مال تجارت کا نصاب یہ ہے، یہ ساری تفصیل تمہیں معلوم ہے، قرآن کریم سے نکال کر دکھا سکتے ہو؟ کہا کہ نہیں! فرمایا: تم کو شرم نہیں آتی یہ فرائض تم نے ہم سے سیکھے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے اور آج مجھے کہتے ہو کہ قرآن کریم سے اس کی دلیل دکھاؤ! ایسی اور بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں۔ تو زکوٰۃ ایک خاص مقدار پر، خاص شرائط کے ساتھ اور خاص مقدار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض فرمائی ہے اور زکوٰۃ کوئی ٹیکس نہیں ہے، تاوان نہیں ہے۔

زکوٰۃ ٹیکس نہیں، عبادت ہے:

ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے ایک دفعہ کہا تھا کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے، زکوٰۃ لینا حکومت کا کام ہے اور یہ کہ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! حکومت اس کی مقدار میں بھی رد و بدل کرسکتی ہے، بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، میں نے اس وقت لکھا تھا اور میرا یہ مضمون نوائے وقت لاہور میں چھپا تھا، میں نے لکھا تھا کہ ٹیکس اور زکوٰۃ میں فرق ہے، زکوٰۃ ٹیکس نہیں ہے، بھائی! یہ تو عبادت ہے جو لوگ زکوٰۃ کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت

میں ان کے اندر ایمان نہیں ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ایسے ہی ٹیکس ہے جیسے گورنمنٹ کا ٹیکس ہے، اس کو بچاؤ جتنا بچاسکتے ہو، یہ نعوذ باللہ! مولویوں کا لگایا ہوا ٹیکس ہے، بھائی! یہ بات نہیں ہے، حق تعالیٰ نے کچھ عبادتیں بدن سے متعلق فرمائی ہیں جن کو عبادات بدنیہ کہا جاتا ہے، کچھ عبادتیں مال کے متعلق فرمائی ہیں تو زکوٰۃ اور حج یہ مال سے تعلق رکھنے والی عبادتیں ہیں، حج میں دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، عبادت بدنی بھی پائی جاتی ہے، بدن کی مشقت بھی اور پیسے بھی خرچ کرنے پڑتے ہیں، اس لئے علمأ فرماتے ہیں کہ حج عبادت مرکبہ ہے، مال اور بدن دونوں سے متعلق ہے، زکوٰۃ خالص عبادت مالیہ ہے، اسی طرح قربانی اور صدقہ فطر بھی عبادت مالیہ ہے، فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ تو اللہ تعالیٰ نے ہر مال دار پر متعین کی ہوئی ہے جس کو عام طور پر زکوٰۃ کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے، صاحب نصاب ہو، ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کا مالک ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں سے چالیس واں حصہ لازم آجاتا ہے، یہ زکوٰۃ ہے، اور ایک عبادت واجب کے درجے میں ہے اور وہ قربانی اور صدقہ فطر ہے۔

قربانی اور ملاحدہ کے شکوک وشبہات:

قربانی کے بارے میں تو کئی دفعہ بیان میں بات آبھی چکی ہے، بہت سے لوگ اس کے ویسے ہی منکر ہیں، نعوذ باللہ! یوں سمجھتے ہیں کہ قربانی کرنا مال کو ضائع کرنا ہے، بلاوجہ بکرے ذبح کئے جاتے ہیں، استغفر اللہ! اتنا چندہ مسکینوں کی فلاح و بہبود میں دے دیا جائے، لوگوں کو ان کی بات بڑی اچھی لگتی ہے لیکن ان سے کوئی پوچھے کہ تم جو عیاشیاں اپنے نفس کے لئے کرتے ہو، لغویات اور عیاشیوں کے لئے جو خرچ کرتے ہو، وہ جائز ہے؟ مجھے کہنے کی اجازت دی جائے کہ فحاشیوں کے لئے کبھی تمہیں خیال نہیں آیا کہ بجائے اس فضول خرچی اور گناہوں کے کاموں میں خرچ

کرنے کے اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا جائے؟ چلو اللہ تعالیٰ کے راستے میں تم دینے کے قائل نہیں ہو، تم اپنی قوم کے لئے خرچ کرو، اپنے وطن کے لئے خرچ کرو، مگر سچ یہ ہے کہ ان لوگوں کو نہ اللہ اور رسول سے تعلق، نہ اپنی قوم و وطن سے تعلق، صرف نفس شریف سے تعلق ہے، یہ نہ ملک کے خیرخواہ، نہ اپنی قوم کے خیرخواہ، نہ انسانیت کے خیرخواہ، تو قربانی کے دنوں میں قربانی واجب ہے۔

وجوبِ قربانی کا نصاب:

مختصر سی بات اس قربانی کے بارے میں بھی عرض کردوں، قربانی صاحب نصاب پر ہوتی ہے جو شخص کہ صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے، یعنی اس کی ضروریات سے فالتو چیز موجود ہو، اب جس گھر میں ٹی وی موجود ہے، شریعت اس کی ضرورت تسلیم نہیں کرتی، اس پر قربانی واجب ہے اور یہ بات بھی یاد رہنی چاہئے کہ جو شخص صاحب نصاب ہو اس پر قربانی واجب ہے، بیوی کو جہیز میں زیور ملا ہے اور وہ بقدر نصاب ہے تو اس پر الگ قربانی واجب ہے، میاں پر الگ واجب ہے بشرطیکہ وہ صاحب نصاب ہو، باپ بھی صاحب نصاب ہے، بیٹا بھی صاحب نصاب ہے، برسر روزگار ہے خواہ ایک ہی جگہ رہتے ہوں تو بیٹے پر الگ قربانی واجب ہے، باپ پر الگ قربانی واجب ہے، اماں پر الگ قربانی واجب ہے اگر وہ نصاب کی مالکہ ہو۔

بزرگوں کی شان!

میرے والد مرحوم، اللہ غریق رحمت فرمائے قربانی کے موقع پر ہمیشہ نو (۹) قربانیاں کرتے تھے، چار ان کے بیٹے تھے اور چار ان کی بہوویں تھیں، اور ایک اپنی، کیونکہ سب ایک ساتھ رہتے تھے، اگرچہ ہم الگ کھاتے پیتے تھے، ہم باہر ہی رہتے تھے لیکن عید کے موقع پر گھر چلے جاتے تھے، یہ معاملہ والد صاحب ہی کے سپرد تھا، بزرگوں کی عجیب ہی شان تھی، اب تو نفسا نفسی کا عالم ہے۔

والد صاحب کی زندگی میں میں نے کبھی اپنے یا اپنی بیوی کے کپڑے خریدنے کی جرأت نہیں کی، حالانکہ میں نے کہا کہ میں مدرسوں میں الگ رہتا تھا، کبھی خیال نہیں آیا کہ سال بھر باہر رہتا ہوں، ہمیشہ یہی سوچا کہ وہ بڑے تھے وہی کریں، اور یہی حال ہمارے دوسرے بھائیوں کا تھا، یہ نہیں کہ نعوذباللہ! ہمیں انقباض تھا کہ والد صاحب نے ایسا کنٹرول کیا ہوا ہے، نہیں یہ بھی گویا اعزاز کے طور پر تھا، پرانے زمانوں میں بزرگوں کی بزرگ داشت اور چھوٹوں کی خورد داشت کا عجیب وغریب سماں ہوتا تھا۔

نئی روشنی کی تاریکی:

اب ہماری نالائقی کی وجہ سے وہ زمانہ آیا کہ بزرگوں کو بزرگ نہ سمجھا اور چھوٹوں کو چھوٹا نہ سمجھا، جو پڑھ لکھ گئے ہیں ان کو روشنی کچھ زیادہ ہی پہنچ گئی ہے اور اس زمانہ کو تاریکی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ روشنی ایسی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ”جگمگاتے ہیں در و دیوار دل بے نور ہے۔“ یہ ظاہری روشنی ایسی ہے کہ تمہاری نئی روشنی کے سبب دماغ بھی تاریک اور دل بھی تاریک، اس لئے برخوردار، ابا میاں کو اپنے سے بے وقوف سمجھتے ہیں، خود عقل مند ہیں، ابا میاں بے وقوف اور بعض تو ایسے ہیں ان کو اپنے باپ کو باپ کہنے میں بھی شرم آتی ہے۔

ان پڑھ باپ کا پڑھا لکھا بیٹا:

حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ نئی روشنی والوں کا صاحبزادہ کسی جگہ افسر تھا، باپ بے چارہ ان پڑھ تھا، باپ ملنے کے لئے گیا، اب اس کی دیہاتی قسم کی وضع، غیر مہذب قسم کا آدمی، اب وہ کہہ تو نہیں سکتا تھا کہ ابا جان! میرے پاس تشریف نہ لاؤ، موجودہ زمانہ ہوتا تو شاید یہ وارننگ بھی دے دیتا، تو اپنے دوستوں سے تعارف کروایا تو وہ پوچھتے ہیں کہ یہ صاحب کون ہیں؟ کہنے لگا کہ یہ

ہمارے ملازم ہیں۔ حضرت تھانویؒ کے الفاظ ہیں کہ وہ بوڑھا کہنے لگا: ملازم نہیں ہوں بلکہ اس کی ماں کا خصم ہوں۔ اب یہ زمانہ آیا ہے کہ نئی روشنی نے گل کھلایا ہے کہ باپ کو باپ کہتے ہوئے شرم آتی ہے، اور باپ بھی ایسے ہی ہیں بے چارے کہ ''ڈیڈی'' کہلانا پسند کرتے ہیں، ''ابا''، ''ابو'' والا قصہ تو گیا۔

اولاد کا نہیں والدین کا قصور ہے:

رات میں ایک خط کا جواب لکھ رہا تھا، ایک نوجوان نے پوچھا کہ اولاد کی تربیت کرنی چاہئے، اب بجائے اولاد کی تربیت کرنے کے والدین خود شروع ہی سے ان کو دین سے ہٹاتے ہیں، بچہ ذرا باشعور ہوتا ہے تو ان کو الٹی سیدھی چیزیں سکھائی جاتی ہیں، ٹی وی دکھایا جاتا ہے اور دوسری لغویات دکھائی اور سنائی جاتی ہیں، اب اگر اولاد بالغ ہونے کے بعد بگڑے تو اس میں قصور کس کا ہے؟

اولاد ماں باپ کے تابع:

حدیث شریف میں آیا ہے کہ:

''مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ ..... الخ۔'' (مشکوٰۃ ص:۲۱)

ترجمہ:...... ''ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی بنادیتے ہیں، یا نصرانی بنادیتے ہیں، یا مجوسی بنادیتے ہیں۔''

بہت کم ایسا ہوتا ہے:

بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ والدین گمراہ ہوں لیکن اولاد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر ہو، حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنے باپ کو اور اپنی پوری قوم کو ان بتوں کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا، یہ سب

اپنے باپ دادے کا دین پھیلا رہے ہیں، تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تم اور تمہارے باپ دادا صریح غلطی پر پڑے ہوئے ہو، جب تم ان بتوں کو بلاتے ہو تو یہ سنتے کیوں نہیں؟ یہ تمہیں نفع اور نقصان پہنچاتے ہیں؟ پتھر بے چارہ کیا نفع نقصان پہنچائے گا؟ تو یہ تو بہت کم ہوتا ہے کہ اولاد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقش قدم پر چلے، ہاں! بعض اوقات اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی فطری طور پر تربیت فرماتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ اولاد جو کچھ اپنے ماں باپ کو کرتے ہوئے دیکھتی ہے اسی رخ پر چلتی ہے۔

اولاد کی غلط کاری کا وبال:

تو نوجوان نے پوچھا کہ اولاد کی غلط کاریوں کا وبال والدین کو ہوگا یا اولاد کو؟ میں نے جواب لکھا کہ عاقل بالغ ہوجانے کے بعد اولاد خود اپنے افعال کی ذمہ دار ہے لیکن چونکہ ان کی گمراہی اور بدکاری میں والدین کا بھی دخل ہے، اس لئے اولاد تو مجرم ہوگی لیکن والدین بھی ان کے جرم میں برابر کے شریک ہیں، آگے میں نے لکھا کہ والدین قبروں کو چلے جائیں گے اور اولاد غلط راستے پر چل رہی ہوگی، ان کی غلط روی کا وبال والدین کو قبروں میں پہنچتا رہے گا۔

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے:

ہم لوگ اپنے مرحومین کے لئے ایصالِ ثواب کرتے ہیں، حکم بھی ہے کہ ایصالِ ثواب کرو، ان کے لئے دعا کرو، ان کے لئے صدقہ خیرات کرو، ان کے لئے استغفار کرو، ان کے لئے پڑھ کر بخشو تاکہ جو زندگی سے ریٹائر ہوگئے ہیں، قبر میں ان کی پنشن جاری رہے، تو جو نیک والدین نیک اولاد چھوڑ کر جاتے ہیں، یہ نیک اولاد بھی ان کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آدمی کے مرنے کے بعد جو چیزیں اس کی قبر میں پہنچتی ہیں ان میں سے وہ علم ہے جو سکھایا

تھا، اور بعد میں اس پر عمل ہو رہا ہے تو اس کو ثواب پہنچ رہا ہے، اسی طرح کوئی قرآن کریم کا نسخہ ترکہ میں چھوڑ گیا تھا اس کو لوگ پڑھ رہے ہیں تو اس کو ثواب مل رہا ہے، کوئی صدقہ جاریہ کر گیا تھا، مثلاً: مسجد بنادی تھی، کوئی مدرسہ بنادیا تھا، حتیٰ کہ کوئی فلاحی کام کر گیا تھا، کوئی مسافر خانہ بنادیا تھا کہ لوگ آرام کرتے رہیں، مسافر کو ٹھہرانے کا جو ثواب ہے اس کو باقاعدہ ملتا رہے گا۔ انہیں میں سے ایک یہ فرمایا کہ نیک اولاد ہو جو اس کے لئے دعا کرے۔

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ نیک اولاد بذاتِ خود صدقہ جاریہ ہے، نیک اولاد جتنے نیک کام کرے گی جیسے روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ اکابرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس لئے فرمادیا گیا ہے کہ اولاد کو دعا بھی کرتے رہنا چاہیئے تو نیک اولاد والدین کے لئے اگر ایصالِ ثواب نہ بھی کرے، تب بھی نیک اولاد نیک عمل ہے، اور یہ جو فرمایا کہ اس کے لئے دعا کرے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تو ملے گا ہی والدین کو۔ اولاد کو اپنی طرف سے بھی ایصالِ ثواب کرنا چاہیئے کہ یہ والدین کا حق ہے۔

والدین کا حق:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب رحمہ اللہ کے بڑے صاحبزادے حسن بھائی کہہ رہے تھے کہ والد صاحب ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: اولاد کے ذمہ حق ہے کہ اپنے والدین کی قبر پر آٹھ دن کے بعد ضرور جائے، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے تھے کہ لوگ شروع شروع میں تو خوب یاد رکھتے ہیں، تیجہ اور چالیسواں کرتے ہیں، بعد میں بھول جاتے ہیں۔

مرحومین کی طرف سے صدقہ:

ایک صاحب کی والدہ خواب میں آئیں اور کہا کہ میری طرف سے ختم نبوت کو پانچ سو روپے چندہ دے دو، مرحومہ کی عادت تھی کہ مجھے ختم نبوت کے لئے یا

مدرسہ کے لئے پیسے دیتی اور رسید لیتی تھی، اور کہتی تھی کہ میں رسید اس لئے لیتی ہوں کہ یہ جنت کے ٹکٹ ہیں، تو خواب میں آئی تو کہنے لگی کہ میری طرف سے پانچ سو روپے چندہ دے دو۔ اس کے بعد پھر میں نے کہا کہ میں بھی اپنے والد صاحب کی طرف سے دیتا ہوں۔

والدین کو نہ بھولو:

یہ بھی ہونا چاہئے بھائی! تم اپنے کپڑے بناتے ہو، والدین کے لئے بھی بناکے دیا کرو، کیوں نہیں دیتے؟ جوڑا بنا کر بھیجوا ان کو، یعنی جوڑا یا جوڑے کی قیمت کسی محتاج کو دے دو، والدین کے لئے یہ حق شناس اولاد کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنے والدین کو بھولے نہیں بلکہ یاد رکھے۔

اولاد کے گناہوں کے وبال کا حصہ قبر میں پہنچتا ہے:

تو خیر میں تذکرہ کر رہا تھا اس خط کا کہ نیک اولاد جو نیک عمل کرتی ہے مرنے کے بعد والدین کو اولاد کے نیک اعمال کا باقاعدہ حصہ دیا جاتا ہے، ان کے اعمال میں اور ان کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور جو والدین اپنی اولاد کو غلط راستے پر ڈال دیں یا ڈال کر گئے ہیں، نماز ان کو نہیں سکھائی، دین ان کو نہیں سکھایا بلکہ دوسری چیزیں سکھائیں، یعنی جو مشاغل دنیا میں آج کل تمہارے سامنے ہیں۔ اب اولاد تو دنیا میں عیاشیاں اور فحاشیاں کر رہی ہے مگر قبر میں والدین کو سزا مل رہی ہے۔ بھائی! جس طرح نیک اولاد کا حصہ والدین کو قبر میں پہنچتا ہے، بری اولاد جو برے اعمال میں مبتلا ہے (والدین کی غلط تربیت کی بنا پر) ان کے گناہوں کا حصہ، ان کے وبال کا حصہ بھی والدین کو قبر میں پہنچتا ہے۔ افسوس ان لوگوں کے حال پر کہ خود تو دنیا چھوڑ گئے لیکن ان کے گناہوں کے وبال کا پیچھا آج تک نہیں چھوٹا۔ انہوں نے اپنی قبر جو تاریک کی تھی وہ تو کی تھی لیکن آگے مزید سیاہی چڑھ رہی ہے، مزید عذاب میں

اضافہ ہو رہا ہے۔

قربانی گھر کے ہر صاحب نصاب پر:

تو میں گفتگو کر رہا تھا قربانی کے بارے میں کہ ابا کا حصہ الگ ہے، اماں کا حصہ الگ ہے، میاں کا حصہ الگ ہے، بیوی کا حصہ الگ ہے، اگر شوہر نادار ہے اس کے پاس پیسے نہیں، بیوی کے پاس پیسے ہیں تو بیوی کے ذمہ قربانی واجب ہے، شوہر کے ذمہ واجب نہیں، اگر بیوی کے پاس پیسے نہیں یا وہ نصاب کی مالک نہیں ہے، شوہر امیر کبیر ہے تو بیوی کے ذمہ قربانی نہیں شوہر کے ذمہ ہے۔ تو گھر میں جتنے افراد صاحب نصاب ہوں گے اتنی قربانیاں ان کے ذمہ واجب ہوں گی۔

قربانی کا مقصد گوشت نہ ہو:

اور یہ بھی میں نے عرض کیا کہ قربانیوں سے مقصود گوشت کھانا نہیں بلکہ عبادت ہے، گوشت تو ہمیں دوکان پر اس سے بھی زیادہ سستا مل جائے گا، بعض لوگ قربانی کے قائل نہیں، مگر اس لئے قربانی کرتے ہیں کیونکہ وہ تو فرائض کبھی ادا نہیں کرتے تو واجبات کیا ادا کریں گے؟ انہوں نے زکوٰۃ کبھی نہیں دی قربانی کیا کریں گے؟ وہ قربانی صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بچوں کا اصرار ہوتا ہے کہ ہمارے گھر بھی جانور آئے، اللہ تعالیٰ منظور کرے یا نہ کرے۔

میں یہ مسئلہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایسی قربانی کا ثواب نہیں ملے گا، ہاں! اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اور محض رضائے الٰہی کے لئے جانور ذبح کیا جائے اور گوشت مقصود نہ ہو، اس قربانی کا ثواب ملتا ہے، اور اگر گوشت مقصود ہے یا یہ خیال ہے کہ قربانی نہیں کی تو پڑوس والے لوگ کیا کہیں گے؟ تو ایسی قربانی کا بھی ثواب نہیں۔

ایک کی نہ ہوئی تو سب کی نہ ہوگی:

ایک مسئلہ اور بتادیتا ہوں کہ گائے میں سات حصے ہیں، اگر ایک آدمی صرف گوشت کی نیت والا ہوگا تو ساتوں کی قربانی نہیں ہوگی، گائے میں سات حصے تھے، ان میں ایک آدمی ایسا تھا کہ جس کی نیت قربانی کی نہیں تھی، حقیقت میں عبادت کی نیت نہیں تھی، محض گوشت کھانا مقصود ہے، یا ایک رسم ہے تو چونکہ جانور ایک ہی ہے اس لئے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی، یہ جانور ہی قربانی کا نہیں۔

اچھے اور نیک لوگوں کے ساتھ قربانی کرو:

اس لئے کہتے ہیں بھائی! نیک لوگوں کے ساتھ حصے رکھا کرو، اچھے لوگوں کے ساتھ حصے رکھا کرو، یا پھر اپنی الگ قربانی کرو، یہ دھڑے کا مال نہیں چلتا۔

حرام مال والے کے ساتھ قربانی:

اسی طرح جن لوگوں کا پیسہ حرام کا ہے، ان کی قربانی ٹھیک نہیں ہے، اور ان کے ساتھ حصہ رکھنا بھی ٹھیک نہیں ہے، غصب کا پیسہ ہے، رشوت کا پیسہ ہے اور دیگر حرام ذرائع سے حاصل کیا ہوا پیسہ ہے نہ ان کی زکوٰۃ، نہ ان کی قربانی اور نہ ان کا حج، نہ ان کا فدیہ، کوئی چیز قبول نہیں۔

قربانی پاک مال سے ہو:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی طور پر ارشاد گرامی ہے:

”اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ یُحِبُّ الطَّیِّب ..... الخ۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۸۵)

ترجمہ:......”اللہ پاک ہے، پاک مال کو قبول کرتا ہے۔“

ناپاک مال کو قبول نہیں کرتا، مال حرام کا ہے تو صدقہ بھی نہیں کیا جاسکتا تو اگر کسی کا مال حرام ہے اور اس نے قربانی میں حصہ رکھا تو باقی لوگوں کی بھی قربانی نہیں ہوگی، کیونکہ جانور ایک ہے، لوگ اس معاملے میں بہت زیادہ غیر محتاط ہیں، کوئی رافضی ہے اس کو بھی قربانی میں ساتھ کر لیتے ہیں، اور ایک جگہ تو قادیانیوں کا بھی اپنے ساتھ حصہ رکھ لیا، احتیاط نہیں کرتے، احتیاط اس لئے نہیں کرتے کہ دین کے معاملے میں پرواہ نہیں، بے پرواہی ہے۔

قربانی کی کھال کا مسئلہ:

اور اسی طرح قربانی کی کھالوں کا مسئلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک سو اونٹ نحر فرمائے تھے، تریسٹھ اپنے دست مبارک سے اور باقی حضرت علیؓ کو کہہ دیا تھا کہ قربان کردو، تریسٹھ سال عمر شریف تھی، حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے حکم فرمایا تھا کہ میں ان کی کھالوں کو صدقہ کردوں۔ اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جزار کو اجرت نہ دو، یعنی کھال کو قصائی کی اجرت میں نہ دو، ہم اجرت اپنی طرف سے دیں گے حتیٰ کہ قربانی کے جانور کی رسی، اس کی جھول کو بھی صدقہ کردینے کا حکم ہے۔ اور یہاں قصائی کو دے دیتے ہیں، یہ بھی اپنی قربانی برباد کرنے والی بات ہے، اور بہت سارے لوگ اپنی قربانی کی کھالیں ایسے اداروں اور ایسی تنظیموں کو دیتے ہیں جو کہ اپنی من مانیاں کرتے ہیں، ان کو شرعی مسائل کا علم ہی نہیں اور پچھلے دنوں تو قربانی کی بھری ہوئی گاڑیاں چھین لی گئیں، ختم نبوت کی گاڑی بھی چھین لی تھی، قہر کا نتیجہ تو قہر ہی نکلے گا نا! جب آدمی اپنے سر پر قہر اٹھائے گا تو پھر اس کا نتیجہ تو قہر ہی کی شکل میں ہوگا۔

ہمارے اعمال کی آگ:

ہمارے حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بے ادب جو ہوتا ہے وہ تنہا

اپنا برا نہیں کرتا بلکہ جہان کو آگ لگا دیتا ہے، اور پھر آگ اس اکیلے نے لگائی جلتے اس میں سارے ہیں، یہ کراچی میں پچھلے دنوں جو کچھ ہوا کیا خیال ہے؟ یہ گولیاں اور بندوقیں نہیں تھیں، یہ ہمارے اعمال کی آگ تھی اور یہ بدعملیوں کی آگ جب لگتی ہے تو پھر پڑوس کے ساتھ والے پڑوسی کو بھی پکڑ لیتی ہے وہ تو کچھ نہیں دیکھتی۔

بے عقل حکمران:

اب ہمارے بزرجمہر جو عقل کل ہیں کیونکہ جو برسر اقتدار آجائیں نا! جس کی حکومت ہو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کی عقل مجھے دے دی گئی ہے، باقی سارے بے وقوف ہیں، کسی کو کسی کے مسئلہ پر بولنے کا حق نہیں کیونکہ ان کے پاس تو عقل نہیں، عقل تو صرف ہمارے پاس ہے۔

بدعملیوں کی آگ کا علاج:

اب یہ بے چارے ہراساں ہیں، پریشان ہیں کہ فلاں کو پکڑو، فلاں کو اندر کرو، یہ مسئلہ کا حل نہیں ہے، اپنی بدعملیوں کے ذریعہ جو تم نے آگ لگائی ہے اس کو توبہ سے بجھاؤ، اس انتقام کی آگ سے یہ آگ مزید پھیلے گی کم نہیں ہوگی، تم نے مسئلے کا حل بھی غلط تلاش کیا ہے، جس کو چاہا پکڑ کر اندر کردیا، اس سے کیا تم سمجھتے ہو کہ زخم پر مرہم لگ جائے گا؟ یہ آگ جو لگی تھی بجھ جائے گی؟ نہیں! بلکہ اور شدت کے ساتھ بھڑکے گی اور پھر ایسا نہ ہو کہ اس کا لاوا تمہیں بھی بھسم کرڈالے اور قوم کو بھی بھسم کرڈالے۔ عجائبات میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے جو طاغوتی قوتوں اور ہمارے دشمنوں کی کٹھ پتلیاں بنی ہوئی ہیں، وہ ہمارے برسر اقتدار ہیں، وہ ہمارے اوپر حکومت کررہے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے جوتے کھانے کے لئے خود ان کو اپنے اوپر مسلط کیا ہے، مت ماری گئی ہے، جب ایسے لوگ حکمران ہوں گے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا۔

زنانہ عقل کیا گل کھلائے گی؟

کوثر نیازی نے بے نظیر کی حمایت میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ مستثنیات کے طور پر ہی فرض کرلو کہ بے نظیر کو اللہ نے عقل زیادہ دی ہے، علم زیادہ دیا ہے، فہم زیادہ دیا ہے، دوسرے لوگ اس کے مقابلے میں نہیں آتے تو اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا اور وہ رسالہ چھپ رہا ہے، ''بینات'' میں بھی آ رہا ہے، میں نے لکھا کہ جناب کی ممدوحہ کی عقل خداداد کا میں بھی قائل ہوں، اس لئے کہ یہ سارے لغاری، مزاری، چیمے، چھٹے، وٹو، ٹوانے اور نیازی یہ سارے اس کی زلف کے اسیر ہیں۔ قرآن نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہی کہا ہے کہ تمہارا مکر بہت بڑا ہے، شیطان کا مکر، اللہ کی نظر میں کمزور ہے، مگر عورتوں کا مکر بڑا ہے، معلوم ہوا کہ یہ اس سے بھی ڈبل ہے، اور آخر میں میں نے لکھا تھا کہ اس پر میرا رسالہ ختم ہوا کہ یہ زنانہ عقل ملک وملت کے حق میں کیا گل کھلائے گی؟ اس کا انتظار کرو! یہ رسالہ (عورت کی حکمرانی) چھپا ہوا موجود ہے، زنانہ عقل ہی یہ سارے گل کھلا رہی ہے، جو قوم مرد وعورت کے درمیان امتیاز کرنا بھول جائے، اس قوم کا کیا انجام ہوگا؟ جہاں مرد مرد نہ رہے، عورتیں عورتیں نہ رہیں، وہاں اخلاق اور اقدار کا کیا پوچھنا؟

ایدھی اور قربانی کی کھالیں:

تو بھائی! قربانی کی کھالیں بھی اپنی جگہ پر خرچ کرو، ایدھی ٹرسٹ کے بارے میں بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ ایدھی والوں کو پہنچادو، پچھلے دنوں اخبار میں آیا تھا کہ ایدھی کی چندہ کی رقم میں سے جو رقم بنک میں جمع ہے اس کے سود کو خرچ کرتے رہتے ہیں، تمہاری زکوٰۃ وصدقات کی رقوم بنک میں جمع ہیں (ایدھی والوں کی) اور اس کا سود خرچ کرتے رہتے ہیں، اب تمہاری عبادت پوری ہوگی؟ مکمل

ہوگی؟ سوچ لو! اپنے نفع اور نقصان کو خود سوچو، تو جو ادارے اور جو تنظیمیں اس قسم کے گھلپے کرتی ہیں، یا جو نا قابل اعتماد ہیں، جن کے دین یا دیانت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ان کو اپنی قربانی کی کھالیں نہ دو اور ختم نبوت کے لئے تو میں کہا کرتا ہوں کہ اس کو اپنی قربانی کی کھالیں دو، بس اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

صوفیاؒ کے اخلاق

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے انبیاۓ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیاۓ اللہ رحمہم اللہ کی نظر میں دنیا بے قیمت ہے، ان کو اس کی حرص نہیں اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! ہمارے نزدیک دین اور دین کی باتیں بے قیمت ہیں، اس لئے ہمیں اس کی حرص نہیں، تو عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک آدمی کو کسی چیز کی اہمیت معلوم نہ ہو، اس لئے اس کی حرص نہ ہو، لیکن جس چیز کی حرص ہوتی ہے آدمی اپنے تمام وسائل جھونک کر بھی اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

صوفیاءؒ کے اخلاق کے بارے میں گفتگو چل رہی تھی، فرماتے ہیں کہ صوفیاءؒ کے اخلاق میں سے ایک ہے: لڑائی جھگڑا نہ کرنا اور حق کے بغیر غصہ نہ کرنا، حلم اور بردباری اور برداشت سے کام لینا، یہ مضمون مختصر سا دوسرے عنوانات کے تحت پہلے بھی آچکا ہے۔

انسان کے اندر موجود دو قوتیں:

غصہ کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کی حفاظت کے لئے اس کے اندر دو قوتیں رکھی ہیں۔ ایک قوت وہ ہے جو منافع کو حاصل کرنا چاہتی ہے، اس کا نام حرص ہے۔ اور دوسری قوت وہ ہے جو اس سے مضرتوں کو دور کرنا چاہتی ہے، اس کا نام غضب اور غصہ ہے۔ جب بھی انسان کو کوئی چیز ایسی پیش آتی ہے جو طبیعت کے لئے ناگوار ہو تو یہ قوت بھڑکتی ہے اور مدافعت کرنا چاہتی ہے اسی قوت کو غصہ آنا کہتے ہیں۔

اب اگر یہ حق پر ہو پھر تو یہ ٹھیک ہے اور اگر ناحق پر ہو تو غلط ہے۔ یہاں پر

دو باتیں قابل ذکر ہیں۔

غصہ کے بارے میں دو باتیں:

ایک یہ کہ: جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو اگر ضرورت ہو گفتگو کی تو آدمی بحث کرتا ہے، جھگڑا کرتا ہے، تکرار کرتا ہے، لڑائی کرتا ہے، اور اگر ضرورت ہو ہاتھ استعمال کرنے کی تو دست درازی کرتا ہے، مار پٹائی کرتا ہے، یہ ساری انتقام کی شکلیں ہوتی ہیں، اور اگر وہ بھی نہیں کرسکتا، یہ بھی نہیں کرسکتا تو پھر ایک تیسری کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی دل کی رنجش، دل سے آدمی رنجیدہ ہوتا ہے اور جو شخص اس کو نقصان پہنچاتا ہے یا اس کے خیال میں نقصان پہچانا چاہتا ہے، اس کے خلاف رنجش رکھتا ہے، کینہ رکھتا ہے، بغض رکھتا ہے، دل میں اس سے نفرت کرتا ہے اور یہ ساری صورتیں ہیں اسی ایک انتقام کی، اور پیدا ہوتی ہیں اس قوت سے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی ہیں جس کو مدافعت کی قوت کہتے ہیں، اس کا نام غصہ رکھ لیجئے۔

اور دوسری یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کے اندر جو فطرتی اخلاق رکھے ہیں ان کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اب اگر غصہ انسان میں فطری ہے یہ تو آئے گا، اس کو نہیں دبا سکتے یعنی ختم نہیں کرسکتے، مار نہیں سکتے۔

ایک فطری بات:

اور کسی چیز کی چاہت و رغبت اور حرص یہ بھی ایک فطری چیز ہے، انسان کی فطرت کے اندر رکھی گئی ہے، اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز میرے نزدیک قیمتی ہے میں اس کی حرص رکھتا ہوں، آپ کی نظر میں وہ چیز قیمتی نہیں ہے آپ کو اس کی کوئی حرص نہیں ہے، یہ بات تو علم پر مبنی ہے۔

درویش و شیخ الاسلام کا قصہ:

ایک دفعہ ایک بادشاہ، ایک درویش سے ملنے کے لئے گئے، بادشاہ کے

ساتھ ان کے شیخ الاسلام بھی تھے، میں نے پہلے ایک موقع پر بتایا تھا کہ ہمارے طبقہ میں حسد بہت ہوتا ہے، یہ خاص مولوی، قاری بے چاروں کی بیماری ہے، مولوی حسد یعنی ایک دوسرے پر جلنا، (اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ اس سے بالکل پاک ہو)۔ میرا مطلب یہ ہے کہ علمائ میں یہ چیز بہت زیادہ پائی جاتی ہے سوائے ان کے کہ جن کی اصلاح ہوگئی ہو، اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کی خدمت میں، صحبت میں بیٹھنے سے نفس کا تزکیہ ہوگیا ہو، ان کی بات دوسری ہے، ہم اپنے جیسوں کی بات کررہے ہیں، تو بادشاہ کے ساتھ ان کے شیخ الاسلام مولوی صاحب بھی تھے، بادشاہ نے اس بزرگ کی تعظیم کی، بڑا اکرام کیا، مولوی صاحب جل گئے، آخر میں بادشاہ نے ایک تھیلی اس بزرگ کی خدمت میں پیش کی، وہ بزرگ فرمانے لگے کہ: میں اس کو کیا کروں گا؟ آپ لوگوں پر تقسیم کردیجئے، ضرورت مندوں کو دے دیجئے۔ یہ استغنا ایک ایسی چیز ہے جس سے آدمی کی عظمت بڑھتی ہے، اور حرص خصوصاً ''سوال'' ایک ایسی چیز ہے جس سے آدمی ذلیل ہوتا ہے، تو اس بزرگ کے یہ کہنے سے بادشاہ کی نظر میں اس بزرگ کی عظمت اور بھی بڑھ گئی، مولوی صاحب پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، فوراً حدیث پڑھی:

''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ: ''یَھْرُمُ اِبْنُ اٰدَمَ وَیَشُبُّ فِیْہِ اِثْنَانِ: اَلْحِرْصُ عَلَی الْمَالِ وَالْحِرْصُ عَلَی الْعُمرِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۴۹)

ترجمہ:......''فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو خصلتیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں (جوں جوں بوڑھا ہوتا ہے اسی نسبت سے یہ دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں): ایک مال کی حرص اور دوسری لمبی عمر کی حرص۔''

مولوی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو تم انکار کررہے ہو یہ محض ریاکاری

ہے، ورنہ حرص تمہارے اندر بھی موجود ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں۔ بزرگ سمجھ گئے، جب مولوی صاحب نے یہ حدیث پڑھی تو اس بزرگ نے فرمایا کہ: مولوی صاحب! جوان وہ ہوا کرتا ہے جو پیدا ہو، اللہ کا شکر ہے کہ یہ دو چیزیں یہاں پیدا ہی نہیں ہوئیں، جوان کیا ہوتیں؟ اللہ کا احسان ہے کہ یہ دو چیزیں ہمارے دل میں پیدا ہی نہیں ہوئیں، پیدا ہوتیں تو جوان ہوتی ناں! اور پھر فرمایا اگر اجازت ہو تو ایک حدیث میں بھی سنادوں!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”اَلْعُلَمَاءُ اُمَنَاءُ الرُّسُلِ مَا لَمْ یُخَالِطُوا السُّلْطَانَ، فَاِذَا خَالَطُوا السُّلْطَانَ وَدَاخَلُوا الدُّنْیَا فَقَدْ خَانُوا الرُّسُلَ، فَاحْذَرُوْهُمْ!“ (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۸۹۵۲)

ترجمہ:......”علماً رسولوں کے امین ہیں بشرطیکہ بادشاہوں سے مل کر نہ رہیں، ان سے خلا ملا نہ رکھیں اور دنیا میں نہ گھسیں، لیکن جب وہ بادشاہوں سے میل جول کرنے لگیں، خلط ملط کرنے لگیں تو وہ رسولوں کے خائن ہیں، ان سے بچو!“

بادشاہ، شیخ الاسلام سے کہنے لگا کہ: اور چھیڑو!

ایک اور روایت میں ہے:

”اِذَا رَأَیْتَ الْعَالِمَ یُخَالِطُ السُّلْطَانَ مُخَالَطَةً کَثِیْرَةً، فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لِصٌّ۔“ (کنز العمال ج:۱۰ حدیث:۲۸۹۷۳)

ترجمہ:......”جب کسی عالم کو بادشاہ سے زیادہ خلا ملا کرتا ہوا دیکھے تو جان لے کہ یہ ڈاکو ہے۔“

تو میں نے عرض کیا تھا یہ بات عام طور پر ہمارے طبقہ میں ہوتی ہے، اس پر

بات آگئی تھی کہ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہوں جن میں یہ چیزیں پیدا ہی نہ ہوں، تو یہ ہوسکتا ہے۔ مگر میری اور آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی کہ کچھ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو ان چیزوں سے مبرا ہوں۔

لوگ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کوئی بغیر غرض کے بھی کام کرسکتا ہے:

ایک فتوے کے سلسلے میں، معلوم نہیں کہ ابوظہبی سے یا سعودی عرب سے، مجھے خط ملا ہے، جو بہت لمبا چوڑا ہے، اس میں بڑی تفصیل لکھی ہوئی تھی، اس میں لکھا تھا کہ یہ امریکی ڈالر جو سعودی تھیلیوں میں مل رہے ہیں ناں! یہ فتویٰ ان کی برکت ہے۔

میں نے ان کو جواب میں لکھا کہ آپ صحیح فرماتے ہیں، اس سے زیادہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے، آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے، اور یہ بات آپ کے ذہن میں آہی نہیں سکتی کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو بغیر کسی منفعت اور لالچ کے اللہ تعالیٰ کے دین کی بات بتاتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کے بقول:

موحد کہ برپائے ریزی زرش
کہ فولادِ ہندی نہی برسرش
امید و حراسش نہ باشد زکس
ہمین است بنیادِ توحید بس

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والا تم اس کے پاؤں پر سونے کی اشرفیوں کی تھیلیاں ڈال دو یا تلوار اس کی گردن پر رکھ دو، کوئی چیز اس کو حق کہنے سے مانع نہ ہوگی، اس کی امید اور اس کا خوف صرف ایک سے ہیں اور اسی کا نام توحید ہے۔"

حرص و ہوا کے سیلاب میں....:

توحید کی یہی بنیاد ہے، جہاں حرص و ہوا کا سیلاب بہہ رہا ہو اور لوگ بے دست و پا ہوکر اس میں بہہ رہے ہوں، وہاں کسی کی عقل میں آسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوں گے جو بغیر خواہش اور بغیر کسی منفعت کے کوئی بات کہیں اور ان کا نعرہ وہی ہو جو انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نعرہ تھا؟ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔“
(الشعراء:١٠٩)

یعنی میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، میرا معاوضہ صرف ایک اللہ کے ذمہ ہے، جو کچھ کہتا ہوں تم سے کچھ وصول کرنے کے لئے نہیں کہتا۔

قیمتی اور بے قیمت کا معیار!

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک چیز کی مجھے رغبت ہو، اس لئے کہ میری نظر میں وہ چیز قیمتی ہے اور آپ کو رغبت نہ ہو اس لئے کہ آپ کی نظر میں وہ قیمتی نہیں ہے۔ حرص و رغبت تو قیمتی چیز کی ہوتی ہے، جو چیز آدمی کی نظر میں بے قیمت ہو اس کی وہ حرص نہیں رکھتا، جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے:

”مَرَّ (رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) بِجَدْیٍ اَسَکٍّ مَیِّتٍ فَتَنَاوَلَهٗ فَاَخَذَ بِاُذُنِهٖ ثُمَّ قَالَ: اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ؟ فَقَالُوْا: مَا نُحِبُّ اَنَّهٗ لَنَا بِشَیْءٍ وَمَا نَصْنَعُ بِهٖ؟ قَالَ: تُحِبُّوْنَ اَنَّهٗ لَکُمْ؟ قَالُوْا: وَاللهِ! لَوْ کَانَ حَیًّا کَانَ

عَیْبًا فِیْهِ لِاَنَّهٗ اَسَکٌّ، فَکَیْفَ وَهُوَ مَیِّتٌ؟ فَقَالَ: فَوَاللّٰهِ! لَلدُّنْیَا اَهْوَنُ عَلَی اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَیْکُمْ!“

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۴۰۷)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر بکری کے مرے ہوئے بچے پر ہوا، جو کن کٹا بھی تھا، صحابہؓ ساتھ تھے، آپؐ نے اس کا کان پکڑ لیا (اس حدیث پر امام ابوداوٗدؒ نے باب باندھا ہے، ”باب الوضوء من مس المیتۃ۔“ (ابوداوٗد ج:۱ ص:۲۵) یعنی مردار کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا اور وضو کرنا لازم نہیں آتا) اور فرمایا: تم میں کون ہے جو ایک درہم دے کر اس کو خرید لے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کن کٹا ہے اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی کوئی نہ لیتا، اس میں عیب تھا، اب تو یہ مرا ہوا اور مردار ہے اب اس کو کون لے گا؟ فرمایا کہ: جس قدر یہ مردار تمہاری نظر میں ذلیل اور حقیر ہے اللہ تعالیٰ کی نظر میں پوری دنیا اس سے زیادہ ذلیل اور حقیر ہے۔“

اب اللہ تعالیٰ کے جس بندے کی نظر بصیرت صحیح ہوگئی ہو اور دنیا واقعتاً اس کی نظر میں ذلیل اور حقیر ہوگئی ہو وہ اس کی رغبت کیوں کرے گا۔

نماز کی قیمت معلوم نہیں اس لئے دل نہیں لگتا:

ہمارے لوگوں کو تکلیف ہے کہ جی نماز میں دل نہیں لگتا، تسبیح و ذکر میں دل نہیں لگتا، تلاوت میں دل نہیں لگتا، اصل میں ان چیزوں کی دل میں قیمت نہیں ہے۔ کبھی یوں نہیں کہا کہ کھانے میں دل نہیں لگتا، مولوی صاحب کوئی علاج بتاؤ، کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا، کیا کریں؟ بڑا مشکل ہے، پانی پینے بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا، دوستوں کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو دل نہیں لگتا اور جتنی لغویات میں ہم

مصروف ہیں اس میں دل نہیں لگتا، یہ کبھی کسی نے شکایت نہیں کی۔ اس لئے کہ ان چیزوں کی منفعت سامنے ہے۔ نماز کی، روزے کی، زکوٰۃ کی، تلاوت کی، ذکر کی اور تنہائی میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے کی قیمت معلوم نہیں ہے، دل کیوں لگے گا؟ رغبت اسی چیز کی ہوتی ہے جس چیز کی منفعت سامنے ہوتی ہے، اس کی قیمت سامنے ہوتی ہے۔

اہل اللہ کو دنیا کی قیمت معلوم ہے اس لئے ان کو حرص نہیں ہوتا:

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور اولیأ اللہ رحمہم اللہ کی نظر میں دنیا بے قیمت ہے، ان کو اس کی حرص نہیں اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! ہمارے نزدیک دین اور دین کی باتیں بے قیمت ہیں، اس لئے ہمیں اس کی حرص نہیں، تو عرض یہ کر رہا تھا کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک آدمی کو کسی چیز کی اہمیت معلوم نہ ہو، اس لئے اس کی حرص نہ ہو، لیکن جس چیز کی حرص ہوتی ہے آدمی اپنے تمام وسائل جھونک کر بھی اس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

دفع مضرت کے لئے پورے اسباب استعمال کرنے کی وجہ:

اور بالکل یہی قصہ ہے مضرت کے دفع کرنے میں بھی، بچے کے سامنے سانپ رکھ دو، اس کے خوش نما نقوش اس کو بہت اچھے لگیں گے، فوراً پکڑنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس کو پتہ نہیں ہے کہ یہ سانپ ہے، اس لئے شیخ عطارؒ فرماتے ہیں کہ:

زہرے ایں مارے منقش قاتل است

یعنی اس نقشوں والے منقش سانپ کا زہر قاتل ہے۔ جب تک ہمیں کسی چیز کے بارے میں یہ پتہ نہ ہو کہ یہ ضرر رساں ہے اس وقت تک ہماری اندر کی قوت مدافعت بیدار نہیں ہوگی، سوتی رہے گی، کچھ نہیں کہے گی، لیکن جوں ہی معلوم ہوا کہ یہ ضرر رساں ہے تو اس سے بچنے کے لئے اپنی پوری طاقت خرچ کردے گی اور وجود

کے پورے لشکر کو اس کے لئے استعمال کرلے گی، اس کو غضب کہتے ہیں۔

لڑائی کے اسباب:

پھر جیسے کہ میں نے کہا کہ اس کے تین درجے ہیں، اگر ہاتھ استعمال کرسکتا ہے تو ہاتھ کو استعمال کرے گا، زبان استعمال کرسکتا ہے تو زبان استعمال کرے گا اور یہ نہیں کرسکتا تو پھر کم از کم دل میں برا سمجھے گا ہی، تو یا تو مارکٹائی ہوگی، یہ نہ ہو تو لڑائی جھگڑا ہوگا، یہ بھی نہ ہو تو کینہ اور بغض تو ضرور ہی ہوگا، کیونکہ دل پر تو کسی کا پہرا نہیں بٹھایا جاسکتا، تو معلوم ہوا کہ جوش انتقام کی وجہ سے لڑائی جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

غصہ رکھوالا ہے:

آپس میں جو لوگ لڑتے ہیں یا بحث وتکرار کرتے ہیں یہ شروع ہوتا ہے جوش انتقام اور غصہ کی بنا پر اور ہماری شریعت نے جیسا کہ میں پہلے بھی بتاچکا ہوں یہ بتایا ہے کہ یہ کتا ہے، تمہارے گھر پر پاسبانی کے لئے رکھا ہوا ہے، یہ غصہ جو ہے ناں غصہ، یہ گھر پر پالا ہوا کتا ہے، کسی گھر کے اندر کوئی چور ڈاکو آئے تو مالک کو بتانے کے لئے اس کو ضرور بھونکنا چاہئے، لیکن اگر یہ ہر ایک کو کاٹتا پھرے تو پھر معلوم ہوا کہ کتا باؤلا ہوگیا ہے اور باؤلے کتے کو شوٹ کردیا کرتے ہیں، گولی ماردیا کرتے ہیں۔

غصہ کی زیادتی جنون کی علامت ہے:

اگر ہم ہر ایک سے لڑائی بھڑائی کرتے پھریں، اس میں دوست اور دشمن کی کوئی تمیز نہ کریں، اپنے اور پرائے کا کوئی امتیاز نہ کریں، کبھی ماں پر غصہ آرہا ہے، کبھی باپ پر آرہا ہے، کبھی بھائی پر آرہا ہے، کبھی بہن پر آرہا ہے، کبھی پڑوس والوں پر آرہا ہے اور کبھی دوست پر آرہا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ کتا پاگل ہوگیا ہے، اتنی عقل تو اللہ تعالیٰ نے کتے کو بھی عطا فرمائی ہے کہ مالک ہو یا گھر کا کوئی اور فرد ہو اور وہ اس کے پاس سے گزرے تو وہ دم ہلانے لگتا ہے، اس کو بھونکتا نہیں ہے۔

قوتِ غضبیہ دفع مضرت کے لئے ہے:

تو ہمارے اندر جو غصے کی قوت رکھی گئی ہے اس کا مقصد بھی مضرات کی مدافعت کرنا ہے، لیکن یہ نہیں کہ ہر جگہ بھڑکتا پھرے۔ تول کر کے دیکھو کہ تمہیں جو مضرت پہنچ رہی ہے اس کے مقابلے میں کوئی منفعت بھی مل رہی ہے کہ نہیں، دونوں کا موازنہ کرو۔

والدین کے غصہ کی منفعت:

اب والدین جھڑکتے ہیں، اپنے بچے کو ڈانٹتے ہیں، بچہ غصہ ہوتا ہے، بے وقوف ہے، والدین کا نصیحت کرنا اس کی منفعت اور ذرا تھوڑا سا اس کو ڈانٹنے کی جو تکلیف ہوئی ہے وہ مضرت، ان دونوں کا مقابلہ کرو کہ کس کا پلہ بھاری ہے؟

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے اپنا بیٹا مکتب میں پڑھنے کے لئے بٹھایا اور چاندی کی تختی بنا کر دی، اس پر سونے کے حروف سے یہ الفاظ لکھ کر دیئے: ''جورے استاذ بہ از مہر پدر'' استاذ کا ظلم اور استاذ کی سختی باپ کی شفقت سے بہتر ہے۔ قاری صاحب نے ایک بچے کے طمانچہ مار دیا، گھر کے لوگ آگئے، عورتیں تک آکر بے چاری کو سنے دیتی ہیں، اچھا بھائی! تمہاری خوشی، تمہارا یہ غصہ بھڑکنا چاہئے تھا، پہلے مقابلہ کرلیتے کہ اس منفعت اور اس مضرت کے درمیان میں نسبت کیا ہے؟ پلہ کس کا بھاری ہے؟ ایک طرف منفعت بھی ہے اور ایک طرف مضرت بھی ہے، تو دونوں میں سے پلہ کس کا بھاری ہے؟ اگر مضرت کا پلہ بھاری تھا، پھر تو تمہارا غصہ بھڑکنا چاہئے تھا، لیکن اگر منفعت کا پہلو بھاری ہے اور مضرت ایسی کچھ خاص نہیں ہے، وقتی چیز ہے تو پھر اس پر غصے کا ہونا یہ بے عقلی کی بات ہے۔

جیسے تمہارے یہاں کوئی مہمان آتا ہے، بڑا معزز مہمان اور کتا اس کو بھونکتا ہے، بے عقل ہے، جانتا نہیں ہے کہ ان مالکوں کا اس مہمان کے ساتھ کیا تعلق ہے،

یہ ان مہمانوں کو بھی دشمن سمجھ رہا ہے اور دشمن سمجھ کر بھونکتا ہے، یہ تو میں نے غصے کے بارے میں کچھ تفصیلات ذکر کیں۔

مامور وممنوع غصہ:

اب جو بات حضرتؒ فرما رہے ہیں اس کی تشریح کرتا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ: صوفیا کے اخلاق میں سے ہے لڑائی جھگڑے کو چھوڑ دینا اور غصے کو چھوڑ دینا، مگر حق کے ساتھ یعنی اگر کسی حق بات پر لڑائی جھگڑے کی نوبت آئے یا غصہ کی نوبت آئے تو پھر تو وہ دوسری بات ہے، غصہ ہونا چاہیئے آدمی میں، لیکن غصہ اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہونا چاہیئے، غضب فی اللہ ہونا چاہیئے، غضب لنفسہٖ اپنی ذات کے لئے نہیں، غصے کے گلے میں رضائے الٰہی کی زنجیر باندھ دو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے غصہ ہو، اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر نہ ہو۔

غصہ حدود اللہ توڑنے پر ہو:

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

”وَمَا انْتَقَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِہٖ اِلَّا اَنْ تُنْتَھَکَ حُرْمَۃُ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔“

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۵۶)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام نہیں لیا، (کوئی کچھ کہتا رہے، انتقام نہیں لیا) مگر جب اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑا جاتا، یعنی اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدوں کو توڑا جاتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آتا تھا اور ایسا غصہ آتا تھا کہ کوئی اس کا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔“

قریش کی ایک عورت نے چوری کرلی تھی، جس کا نام فاطمہ تھا، اب قریش نے کہا کہ: اگر اس خاتون کا ہاتھ کٹ گیا تو بڑی بدنامی ہوگی کہ قریش کی خاتون کا ہاتھ کٹ گیا، یہ قریش کے لوگ چور ہیں، اتنا بڑا خاندان! اور ایسی بدنامی؟ اور لوگ بھی ایسے بے وقوف ہوتے ہیں کہ ایک کا فعل پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ تو بڑی بدنامی ہوگی، اس لئے ایسا کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں درخواست کرو کہ اس عورت پر حد جاری نہ کریں، سزا جاری نہ کریں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے کی جرأت کس کو ہو؟ انہوں نے سوچا کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی لاڈلے اور پیارے ہیں، ان سے کہا جائے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں عرض کریں، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نوجوان سے تھے، یہی کوئی سولہ سترہ سال کی اس وقت ان کی عمر ہوگی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب تھے، حضرات حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسی ان سے محبت فرماتے تھے، چنانچہ حضرت اسامہؓ کو کہا گیا اور حضرت اسامہؓ تو چونکہ بھولے بھالے نوجوان تھے، کم عمری کی وجہ سے ان باتوں کو سمجھتے نہیں تھے، انہوں نے جاکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کردی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بات کو سننا تھا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہوگیا اور گرج کر فرمایا: ''اَتَشْفَعُ فِیْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ؟'' (مشکوٰۃ ص:۳۱۴) تو اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے ایک حد کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتا ہے؟ اس کے بعد ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل اسی لئے ہلاک ہوئے کہ ان میں جب کوئی شریف آدمی، جب کوئی کمزور آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تھا تو اس پر سزا جاری کردیتے تھے اور جب کوئی بڑا آدمی جرم کا ارتکاب کرتا تھا تو سزا جاری نہیں کرتے تھے۔

ہمارے ہاں دوہرا معیار:

ہمارے ہاں بھی یہی ہو رہا ہے ناں؟ ہاں یہی ہو رہا ہے، پھر ہلاکت میں کیا شبہ ہے؟ اگر کوئی بے چارہ غریب آدمی کوئی جرم کرلے اس کی تأویل بھی ہوسکتی ہے، لیکن ہم تأویل نہیں کریں گے، کبھی کوئی غلط فہمی ہوگئی، اس کی بھی تأویل نہیں کریں گے، اور اس غریب پر ایک ایک گز کی زبان ہم میں سے ہر ایک کی کھلی ہوئی ہوگی، چلو اس نے جرم کیا، سزا مل جائے گی، مجھے اور آپ کو اس کے بارے میں بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں بھائی! میرا اور آپ کا کیا قصہ ہے اس میں؟ لیکن نہیں ہم میں سے ہر ایک آدمی کی ایک گز زبان باہر نکلی ہوئی ہوگی اور پورے محلے میں جہاں جہاں تک معلوم ہوگا ہر ایک آدمی باتیں کرے گا۔ کیوں کرتے ہو؟ تمہارا اس مسئلے سے کیا تعلق ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ غریب ہے، کمزور ہے، جس آدمی کو بات نہیں کرنی چاہئے وہ بھی کرتا ہے، بھائی! اس سے جرم ہوا اور قانون نے اس کو پکڑ لیا، سزا مل جائے گی بس ختم، تم بیچ میں کیوں بولتے ہو؟ اور کیوں تبصرے کرتے ہو؟ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن یہ تمہارے تبصرے کس مد میں آئیں گے؟

اور اگر کوئی بڑا آدمی جرم کرلیتا ہے تو سب اس کی تأویل کرتے ہیں اور اس کو چھپاتے ہیں اور عدالت تک پہنچ کر اس جج کو رشوت بھی دینی پڑے تو سزا کو ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر ہلاکت میں کیا شبہ ہے؟ تو بھائی! غصہ للّٰہ فی اللّٰہ ہونا چاہئے، اللہ کی خاطر غصہ ہونا چاہئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ اللہ کی خاطر آتا تھا، اپنی ذات کے لئے نہیں۔

صوفیأ کے اخلاق:

تو صوفیا کے اخلاق میں سے یہ ہے کہ جو چیز اپنے خلاف جاتی ہو، اس کو تو برداشت کرتے جاؤ، اس کو حلم کہتے ہیں اور جو چیز دین کے خلاف جاتی ہو تو اللہ کے

لئے غصہ کرو، یہ الغضب للہ اور الغضب فی اللہ کہلاتا ہے، محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، غصہ بھی اللہ کے لئے ہو، کسی سے محبت رکھو وہ بھی اللہ کی خاطر رکھو اور کسی سے بغض رکھو تو وہ بھی اللہ کی خاطر رکھو۔ یہ ایمان کا بہت اونچا منصب ہے۔

اونچا مقام:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

”مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۴)

ترجمہ:...... ”جس نے محبت رکھی تو اللہ تعالیٰ کے لئے، بغض رکھا تو اللہ کے لئے، کسی کو کچھ دیا تو اللہ تعالیٰ کے لئے، نہ دیا تو اللہ کے لئے، اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔“

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ایثار و مواسات

ایک بزرگ ہیں ابوحفص رحمہ اللہ تعالیٰ وہ فرماتے ہیں کہ ایثار یہ ہے کہ اپنے بھائیوں کی لذتوں کو اور ان کے حصوں کو اپنے نفس کے حصے پر ترجیح دی جائے، دنیا میں اور آخرت میں۔ یعنی آدمی یہ چاہے کہ دوسرا مجھ سے آگے بڑھ جائے میں پیچھے رہ جاؤں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

''ایثار'' کے معنی ہیں اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینا اور ''مواسات'' کے معنی ہیں ایک دوسرے کی ہمدردی، خیرخواہی اور غم خواری کرنا۔

ایک صحابی کا ایثار:

اس سلسلے میں حدیث شریف کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا تھا کہ:

''..... فَذَهَبَ اِلٰى اَهْلِهٖ فَقَالَ لِامْرَأَتِهٖ: ضَيْفُ رَسُوْلِ اللهِ لَا تَدَّخِرِيْهِ شَيْئًا۔ قَالَتْ: وَاللهِ مَا عِنْدِیْ اِلَّا قُوْتُ الصِّبْيَةِ! قَالَ: فَاِذَا اَرَادَ الصِّبْيَةُ الْعَشَاءَ فَنَوِّمِيْهِمْ وَتَعَالِیْ فَاَطْفِئِی السِّرَاجَ وَنَطْوِی بُطُوْنَنَا اللَّيْلَةَ۔ فَفَعَلَتْ ثُمَّ غَدَا الرَّجُلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ .... فَاَنْزَلَ اللهُ: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔'' (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۲۵، ۷۲۶)

ترجمہ:...... ''رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک

مہمان کو ایک صحابی اپنے گھر لے گئے (ان کے پاس گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں تھی)، بیوی نے کہا کہ: اتنا کھانا ہے جو صرف بچوں کو کھلایا جاسکے۔ اس صحابی نے فرمایا کہ: بچوں کو تم بہلا دو، کھانا تیار کر دو، ہم بیٹھ کر کھانا کھانے لگیں گے تو تم چراغ گل کر دینا۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا، مہمان نے کھانا کھالیا اور وہ میاں بیوی اپنے بچوں کے ساتھ بھوکے رہے، صبح کو قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

”وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔“ (الحشر:۹)

ترجمہ:......”اور وہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اپنی ذات پر اگرچہ خود فاقہ اور حاجت ہو۔“

بکری کی سری کا سات گھروں سے واپس آنا:

اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

”(وَاَخْرَجَ الْوَاحِدِيُّ) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: اَهْدٰى الرَّجُلُ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأْسَ شَاةٍ، فَقَالَ: اِنَّ اَخِيْ فُلَانًا وَعِيَالُهٗ اَحْوَجُ اِلٰى هٰذَا مِنَّا، فَبَعَثَ بِهٖ اِلَيْهِ، فَلَمْ يَزَلْ يَبْعَثُ وَاحِدٌ اِلٰى آخَرَ حَتّٰى تَدَاوَلَهَا اَهْلُ سَبْعَةِ اَبْيَاتٍ حَتّٰى رَجَعَتْ اِلٰى اُولٰئِكَ فَنَزَلَتْ: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔“

(التفسیر المنیر پارہ:۲۸ ص:۷۹)

ترجمہ:......”ایک آدمی مشقت میں تھا یعنی گھر میں

فاقہ تھا، اس کو کوئی شخص بکری کی بھنی ہوئی سری دے گیا، اس نے یہ سوچا کہ میرا ہمسایہ مجھ سے زیادہ مستحق ہے، اس صحابی نے وہ سری اس کے گھر بھیج دی، اس دوسرے نے تیسرے کے پاس، تیسرے نے چوتھے کے پاس، یہاں تک کہ سات جگہ گھومنے کے بعد وہ سری واپس اس کے پاس آگئی اور اس پر حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

”وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔“ (الحشر:۹)

ترجمہ:......”یہ لوگ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں چاہے خود کو بھوک ہو۔“

مسلمانوں کے ایثار کا واقعہ:

شیخ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوالحسن انطاکیؒ فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ تیس سے اوپر کچھ آدمیوں کا مجمع جمع ہوگیا اور کھانے کے لئے صرف پانچ روٹیاں تھیں، رات کا وقت تھا، ان روٹیوں کے ٹکڑے کردیئے گئے، دسترخوان پر بچھادیئے گئے، دوستوں نے مشورہ دیا کہ بھائی کون کتنا کھاتا ہے، کون کتنا نہیں کھاتا پتہ نہ چلے، چراغ گل کردو، چراغ بجھادو، چراغ بجھادیا تو کھاپی کر سب کے سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن کھانا سب کا سب باقی تھا، کسی نے بھی نہیں کھایا اس خیال سے کہ میں بھوکا رہ جاؤں تو کوئی حرج نہیں دوسرے کھالیں، یہ ایثار ہے۔

دیانت کے امتحان کا ایک واقعہ:

اس کے مقابلے میں وہ مشہور حکایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادشاہ نے اپنی رعایا کا امتحان لینے کے لئے کہ لوگوں میں کتنی امانت پائی جاتی ہے؟ یہ حکم دیا کہ یہ

ایک حوض ہے، رات کے اندھیرے میں اس میں ایک ایک گلاس دودھ کا ڈالتے جاؤ، صبح کو یہ بھرا ہوا ہونا چاہئے، لیکن ایک گلاس سے زیادہ کوئی نہ ڈالے، صبح ہوئی تو وہ پانی سے بھرا ہوا تھا، ایک شخص نے یہ خیال کیا کہ میں ایک گلاس پانی کا ڈال دوں گا دوسرے لوگ تو دودھ ہی ڈالیں گے ناں! تو کیا پتہ چلے گا؟ سب نے یہ خیال کرکے کہ میرے ایک گلاس سے کچھ پتہ نہیں چلے گا، ہر ایک نے پانی کا گلاس ڈال دیا، صبح کو بجائے دودھ کے حوض پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ دیانت و امانت کا امتحان تھا۔

جنگِ یرموک میں دو صحابہؓ کا ایثار:

صحابہ کرامؓ میں حضرت حذیفہ عدوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

”اِنْطَلَقْتُ یَوْمَ الْیَرْمُوْکِ اَطْلُبُ ابْنَ عَمٍّ لِیْ وَمَعِیَ شَیْءٌ مِّنَ الْمَاءِ وَاَنَا اَقُوْلُ اِنْ کَانَ بِہٖ رَمَقٌ سَقَیْتُہٗ، فَاِذَا اَنَا بِہٖ، فَقُلْتُ لَہٗ: اَسْقِیْکَ؟ فَاَشَارَ بِرَأْسِہٖ اَنْ نَعَمْ، فَسَمِعَ آخَرَ یَقُوْلُ: آہ! آہ! فَاَشَارَ اِلَیَّ اِبْنَ عَمِّیْ اَنِ انْطَلِقْ اِلَیْہِ فَاِذَا ھُوَ ھِشَامُ بْنُ الْعَاصِ، فَقُلْتُ: اَسْقِیْکَ؟ فَاَشَارَ اَنْ نَعَمْ، فَسَمِعَ آخَرُ یَقُوْلُ: آہ! آہ! فَاَشَارَ ھِشَامٌ اَنِ انْطَلِقْ اِلَیْہِ، فَجِئْتُہٗ فَاِذَا ھُوَ قَدْ مَاتَ، فَرَجِعْتُ اِلٰی ھِشَامٍ فَاِذَا ھُوَ قَدْ مَاتَ، فَرَجِعْتُ اِلٰی اِبْنَ عَمِّیْ فَاِذَا ھُوَ قَدْ مَاتَ۔“

(تفسیر قرطبی ج:۱۸ ص:۲۲)

ترجمہ:......”میں جنگ یرموک میں (یرموک کی جنگ ہوئی تھی، یرموک جگہ کا نام ہے، یہ جنگ اہل فارس کے ساتھ ہوئی تھی اور بڑی شدید جنگ تھی، بہت سے صحابہؓ اور تابعینؒ اس میں شہید ہوئے تھے، بہت ہی سخت معرکہ تھا) کہنے لگے کہ میں زخمیوں میں اپنے چچازاد بھائی کی تلاش میں نکلا، میرے پاس

تھوڑا سا پانی تھا، خیال تھا کہ اگر کوئی رمق زندگی کی باقی ہوگی تو میں اس کو پانی پلاؤں گا، چنانچہ تلاش کرتے ہوئے میرا چچازاد بھائی مجھے مل گیا، وہ اس وقت زندہ تھا، میں نے کہا کہ: تمہیں پانی دوں؟ انہوں نے سر سے اشارہ کیا کہ ہاں! کہتے ہیں کہ میں پانی اس کو دینے لگا اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، اس نے اس کی طرف اشارہ کردیا کہ اس کو پہلے دو، یہ صاحب ہشام بن عاص تھے، میں ان کے پاس دوڑا ان کو پانی دینے کے لئے اتنے میں ان کے کان میں دوسرے آدمی کی آواز پہنچی، انہوں نے کہا کہ اس کو دو، وہ ذرا تھوڑے فاصلے پر تھے میں ان کے پاس پہنچا تو وہ مسافر ہوچکے تھے، اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کرچکے تھے، میں ان کو پانی نہیں پلاسکا، لوٹ کر ہشام بن عاص کے پاس پہنچا تو وہ بھی رخصت ہوچکے تھے، وہاں سے اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا تو میرے آنے تک وہ بھی ختم ہوچکے تھے۔‘‘

موت کے وقت کی پیاس کی شدت اور خصوصاً گرمی کے موسم میں زخمی کے لئے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے ایثار اور قربانی کی ایسی مشق ہوگئی تھی کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، باوجودیکہ خود موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔

ایثار کی تعریف اور مقام:

ایک بزرگ ہیں ابوحفص رحمہ اللہ تعالیٰ وہ فرماتے ہیں کہ ایثار یہ ہے کہ

اپنے بھائیوں کی لذتوں کو اور ان کے حصوں کو اپنے نفس کے حصے پر ترجیح دی جائے، دنیا میں اور آخرت میں۔ یعنی آدمی یہ چاہے کہ دوسرا مجھ سے آگے بڑھ جائے میں پیچھے رہ جاؤں۔

اعمالِ صالحہ میں ایثار کا حکم؟

اس میں علمأ کا اختلاف ہے کہ خیر کے کاموں میں ایثار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مثال کے طور پر پہلی صف کی فضیلت ہے، اب ایک آدمی پہلی صف میں آکے بیٹھا ہے اور پیچھے دوسری صف میں کوئی نیک آدمی آکر بیٹھ گیا تو کیا اس کو اپنی جگہ چھوڑ کر اس بزرگ کو جگہ دینی چاہئے یا نہیں؟ اس معاملے میں ایثار کرنا چاہئے کہ پہلی صف کی فضیلت میرے بجائے اس بزرگ کو حاصل ہوجائے؟

بعض حضرات نے اس سے منع کیا ہے کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ علامت ہوگی اس بات کی کہ یہ شخص ثواب سے مستغنی ہے، اس کو ثواب کی ضرورت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ثواب سے مستغنی ہونا ظاہر ہے کہ اچھی بات نہیں ہے، بہت بری بات ہے۔

لیکن محققین کہتے ہیں کہ نہیں! قربات اور عبادات میں بھی ایثار جائز ہے، اس لئے کہ اس کا منشا یہ ہوگا کہ میری عبادت تو پتہ نہیں قبول ہوتی ہے یا کہ نہیں ہوتی؟ اللہ کے اس نیک بندے کی قبول ہوجائے گی اور اس کی برکت سے میری بھی قبول ہوجائے گی، تو اس میں ایک تو دوسرے کو اپنے اوپر مقدم کرنا ہوا، ایثار ہوا اور ایثار اچھی خصلت ہے، دوسرے اس میں بزرگ داشت بھی ہے۔

بزرگ داشت کی تلقین:

ایک دفعہ ایک صحابی عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ ان کا نام ہے، یہ خیبر کے علاقے میں مقتول پائے گئے یعنی کسی نے ان کو قتل کردیا تھا، تو اس مقتول کے دو

چچازاد بھائی اور ایک حقیقی بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے، حقیقی بھائی سب سے چھوٹا تھا یعنی عمر میں سب سے چھوٹا تھا اور دوسرے بڑے تھے، حقیقی بھائی بات کرنے لگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کَبِّرِ الکبریٰ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۰۶) بڑے کو بڑا کرو، یعنی ادب کا تقاضا یہ ہے کہ جس جماعت میں بڑا آدمی موجود ہو، چھوٹے اس جماعت میں نہ بولیں، ہاں جب ان چھوٹوں سے پوچھا جائے جب وہ بولیں، ان سے کوئی بات پوچھی جائے تب بولیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بزرگ داشت کی یہاں تک رعایت فرماتے تھے کہ گفتگو میں بھی بڑا آدمی گفتگو کرے، چھوٹی عمر کا آدمی گفتگو نہ کرے، بڑے کے سامنے چھوٹی عمر کا آدمی گفتگو نہ کرے۔

دسترخوان کا ادب:

اس لئے اکابر فرماتے ہیں کہ: دسترخوان کا ادب یہ ہے کہ جب بڑا آدمی کھانا شروع کرے تب دوسرے لوگ شروع کریں، جب تک وہ بزرگ شروع نہ کرے تب تک یہ لوگ شروع نہ کریں، یہ نہیں کہ جس کے سامنے کھانا آگیا اس نے کھانا شروع کردیا، یہ خلافِ ادب ہے۔

سب کے سامنے کھانا آئے تو شروع کیا جائے:

میرے والد ماجد اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائے، وہ قصہ ذکر کیا کرتے تھے کہ ہمارے علاقے میں ایک مولوی محمد شفیع صاحب تھے، چکّی ایک گاؤں تھا وہاں کے تھے، ان کی لڑکی کی شادی تھی یا نامعلوم کیا قصہ تھا؟ بہرحال برات آئی ہوئی تھی، اور برات ساری مولویوں کی تھی یا اکثر مولوی اور علمأ تھے، اب کھانا رکھنا شروع ہوا تو جس کے سامنے کھانا آیا، اس نے کھانا شروع کردیا، تو دوسروں کے سامنے ابھی کھانا رکھا نہیں گیا کہ انہوں نے ختم کرلیا، لوگوں نے کہا کہ یہ کیا بے تمیزی ہے؟ کھانا پہلے

لگادیں اس کے بعد کھانا شروع کرنا چاہیے، تو مولوی صاحبان نے کہا کہ جب کھانا سامنے آجائے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اس کے بعد انتظار نہیں کرنا چاہیے، ہمارے سامنے کھانا آگیا تھا ہم نے کھانا شروع کردیا۔ میرے والد صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا محمد شفیع صاحب نے ان کو ڈانٹا اور کہا کہ: تمہیں عقل اور تمیز تو ہے نہیں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ جب کھانا سامنے آئے تو کھانا شروع کردیجئے، جب ایک جماعت بیٹھی ہو، جب تک پوری جماعت کے سامنے کھانا نہ آجائے، اس وقت تک شروع نہ کرو اور ابھی تک پوری جماعت کے سامنے کھانا نہیں آیا، تم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

واقعی مولانا محمد شفیع صاحب نے بہت اچھی بات کہی، ایک آدمی کے سامنے کھانا لاکر رکھ دیا اور ایک ہی کھانے والا ہے، اکیلا ہے تو ٹھیک ہے کھائے، لیکن پندرہ آدمیوں کی جماعت دسترخوان پر بیٹھی ہے، ایک آدمی کے سامنے کھانا رکھ دیا اگر وہ کھانا شروع کرے گا تو بے تمیز ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماعت میں سے جس کے سامنے کھانا آجائے وہ کھانا شروع کردے، یہ آدمی نہیں جانور ہے کہ جس کو اتنی بھی تمیز نہیں۔ تو دسترخوان کے بھی آداب ہوتے ہیں بھائی! اور یہ آداب بھی ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور بزرگانِ دین سے معلوم ہوتے ہیں۔

دسترخوان پر ہاتھ دھلانے کی ترتیب:

حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ایک دفعہ حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں ایک مہمان آیا ہوا تھا، دسترخوان رکھا گیا تو خادم ہاتھ دھلانے لگا، مہمان کے پہلے ہاتھ دھلانے لگا حضرت امامؒ نے فرمایا: تمہیں تمیز نہیں ہے، پہلے میزبان کے ہاتھ دھلایا کرتے ہیں، پہلے میرے ہاتھ دھلاؤ۔ کھانے

سے فارغ ہوئے تو وہ خادم حضرت امامؒ کے ہاتھ دھلانے لگا، فرمایا: تجھے تمیز نہیں ہے، مہمان کے ہاتھ پہلے دھلایا کرتے ہیں، یہ حضرات بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں۔

بزرگوں کی ذکاوت حس:

ہمارے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: لوگ بزرگوں کو بے حس سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ جو معاملہ کرتے رہو ٹھیک ہے، ان کو کوئی احساس نہیں ہوتا، بزرگ جو ہوئے۔ یہ اکابر بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں لیکن پھر مزاج اپنا اپنا پایا ہے، بعض حضرات فوراً ٹوک دیتے ہیں اور بعض برداشت کر لیتے ہیں، تسامح کر لیتے ہیں۔

بزرگوں کے اختلافِ مزاج کا قصہ:

ایک دفعہ کسی کو کیا سوجھی کہ وہ ایک بزرگ کا امتحان کرنے لگا، اس بزرگ کو کہہ دیا: حضرت! فلاں وقت آپ کی دعوت ہے، بزرگ کہنے لگے کہ بہت اچھا! وہ آدمی کہنے لگا کہ میں لینے کے لئے نہیں آؤں گا، آپ خود تشریف لے آیئے، فلاں وقت پر آپ آجائیں یعنی عصر کے بعد یا مغرب کے بعد جو وقت بھی دیا، بزرگ فرمانے لگے حاضر ہو جائیں گے، وہ بزرگ تشریف لے گئے تو میزبان صاحب پوچھتے ہیں کہ: حضور! کیسے تشریف آوری ہوئی؟ کہا کہ: بھائی! تم نے دعوت کی تھی، مجھے بلایا تھا! کہنے لگا کہ: کس نے دعوت کی تھی؟ وہ بزرگ فرمانے لگے کہ: کوئی بات نہیں، واپس چلے جاتے ہیں، واپس چلے گئے، جب گلی کی نکڑ پر پہنچ گئے تو وہ آدمی پیچھے پیچھے آیا کہنے لگا کہ: آپ عجیب آدمی ہیں! میں نے آپ کو بلایا ہے دعوت کے لئے اور آپ جا رہے ہیں؟ بزرگ کہنے لگے: اچھا بھائی! وہاں سے پھر وہ لوٹ آئے اور گھر آکر پھر وہ آدمی پوچھتا ہے کہ: آپ کیا دوبارہ پھر آگئے؟ بزرگ نے فرمایا: اچھا بھئی! چلے جاتے ہیں۔ نکڑ پر اس آدمی نے پھر روک لیا، پھر لوٹا دیا، تین دفعہ ایسا ہی کیا، بعد میں اس آدمی نے ہاتھ جوڑے، منت سماجت کی کہ حضرت! میں نے گستاخی کی ہے،

معاف کردیں، میں آپ کا امتحان کرنا چاہتا تھا واقعی آپ اللہ والے ہیں۔ بزرگ نے فرمایا: اس میں ''اللہ والے'' کی کیا ضرورت تھی، یہ تو کتے کی خصلت ہے، اس کو ٹکڑا ڈالو، آجاتا ہے، دھتکار دو چلا جاتا ہے، اس میں ''اللہ والے'' کی کیا بات ہے؟ کتے کو دھتکار دو چلا جاتا ہے، پیچھے ہٹ جاتا ہے جب ٹکڑا دکھاؤ واپس آجائے گا، دس دفعہ اس کو دھتکار دو پھر آجائے گا، اس میں اللہ والے کی کیا بات ہے؟ اس میں کیا بزرگی ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے بھی ہوتے ہیں ہر ایک کا اپنا مزاج ہے۔

دلّی کے تین بزرگوں کے اختلافِ مزاج کا قصہ:

حضرت تھانوی قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: دلّی میں تین بزرگ تھے، تینوں ہم عصر، ایک ہی زمانے میں تین قطب تھے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ اور ایک اور بزرگ تھے۔ کسی شخص نے ان تینوں کا امتحان کرنا چاہا، تینوں کو دعوت کہہ دی کہ حضرت! فلاں وقت دعوت ہے آپ تشریف لے آئیں۔ الگ الگ دعوت کہہ دی، یہ تینوں حضرات تشریف لے گئے، اس نے گھر میں کھانے پکانے کا کوئی سامان نہیں کیا تھا، یہ چلے گئے تو ان کو بٹھادیا اور خود کھسک گیا، کہیں گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد واپس آیا تو دو دو پیسے نکال کر دے دیئے، کہنے لگا کہ: حضور! معاف کیجئے کھانے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ اس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ ایک بزرگ غالباً ان کا نام فخر الدین تھا یا کیا تھا مجھے بھولتا ہے، انہوں نے تو شکریہ ادا کیا اور کہا کہ: بھائی! کوئی بات نہیں ہے، ایسا ہوجاتا ہے، پریشان ہونے کی بات نہیں، مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے پریشانی ہوئی کیونکہ گھر مہمان بیٹھے ہوں اور گھر والوں سے کھانے کا بندوبست نہ ہوسکے تو گھر والوں اور میزبان کو پریشانی ہوتی ہے، ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو ہماری وجہ سے پریشانی ہوئی، معذرت چاہتے ہیں، دو پیسے لیئے اور شکریہ ادا کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی قدس سرہ نے دو پیسے تو لے لیئے لیکن کہا کچھ نہیں خاموش رہے، برداشت کرلیا۔ اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ نہایت ذکی الحس بزرگ تھے، نقشبندی سلسلے کے اکابر اولیأ اللہ میں سے ہوئے ہیں، بہت اونچے آدمی تھے، شیعوں نے ان کو ان کے گھر میں شہید کردیا تھا اور آپؒ نے شہادت سے تین چار دن پہلے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ: بھائی! ہمارا انتقال ہوجائے تو قبر کی لوح پر ہمارا یہ شعر لکھ دینا:

بلوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہ ایں نیست تقصیرے

یعنی لوگوں نے ہماری قبر کے کتبے پر غیب سے یہ تحریر لکھی ہوئی پڑھی کہ اس مقتول کا کوئی گناہ بے گناہی کے سوا نہیں تھا، اس مقتول کا گناہ صرف بے گناہی تھا۔

حضرت مرزا صاحبؒ کا ضبط:

بہت عجیب وغریب صاحبِ کرامت بزرگ تھے، مگر ایک طرف اتنے ذکی الحس اور دوسری طرف بیوی اتنی بدمزاج ملی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ! حضرت کا معمول تھا کہ ایک وقت مقرر کیا ہوا تھا، خادم کو بھیجتے تھے کہ گھر میں بیگم صاحبہ سے پوچھ کر آؤ کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ خادم آتا تو دس بیس تو اس کو سناتی اور دس بیس سناتی اس کے حضرت کو اور پھر بعد میں کوئی کام ہوتا تو بتاتی۔

ایک دفعہ حسب معمول روزانہ جو خادم جایا کرتا تھا وہ نہیں تھا، کسی اناڑی خادم کو بھیج دیا، وہ تھا پٹھان، بیگم صاحبہ نے جب اپنا وظیفہ شروع کیا تو یہ خادم کہتا ہے کہ ہمارے پیر کو ایسے کہتا ہے، قتل کردے گا۔ اور واپس آکے کہا کہ: پیر صاحب! آپ نے ایسا بیوی کیوں رکھا ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا: اوہو غلطی ہوگئی بھائی! تمہیں نہیں بھیجنا تھا، جو جانتے تھے ان کو بھیجنا تھا اور پھر ارشاد فرمایا کہ:

حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے مجھے الہام ہوا تھا کہ تمہارے سلوک کی ترقی اس عورت کے ذریعہ سے ہوگی، اس لئے میں اس کو اپنی محسنہ سمجھتا ہوں۔ اس معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے عجیب وغریب واقعات ہیں۔

بیوی کے معاملہ میں طرزِ عمل:

ایک بزرگ کی بیوی بہت ہی زیادہ بدمزاج تھی، لیکن اس بزرگ نے کبھی کوئی شکایت کا کلمہ زبان سے نہیں نکالا، اگر کوئی ان کی اہلیہ یعنی گھر والی کی بات کرتا تو حضرت فرماتے کہ: بھائی! اپنے گھر والوں کی شکایت کرنا مروت اور شرافت کے خلاف ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کو طلاق دے دی، جدا کردیا، اب اگر کوئی شخص اس کی بات آکر کرتا تو فرماتے کہ: بھائی! وہ عورت اجنبی ہوچکی ہے، ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا، اجنبی عورت کی باتیں کرنا اخلاق اور مروت کے خلاف ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں کی ذکاوت حس:

تو حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں قدس سرہ نے دو پیسے تو لے لیئے لیکن ساتھ ہی فرمادیا کہ: دیکھو بھائی! میری ایک بات سنو! میں تو فارغ آدمی ہوں، میرا تو کوئی ایسا ویسا کام نہیں ہے، بقول ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہ کے صرف نور پھیلانا ہے، لیکن یہ حضرات جو ہیں تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی مشغولیات ہیں، مصروفیات ہیں، دیکھو تم نے ان کا کتنا وقت ضائع کیا، تم نے ان کو بلالیا اور پہلے کھانے کا بندوبست نہیں کیا، اگر تم سے نہیں ہوسکتا تھا تو تم پہلے اطلاع دے سکتے تھے، یہ حضرات آنے کی زحمت ہی نہ فرماتے اور پھر تم ان کو چھوڑ کر غائب ہوگئے، تو ان حضرات کا کتنا قیمتی وقت تم نے ضائع کیا، تمہیں اس کا احساس نہیں ہوا، خبردار! آئندہ ایسی غفلت کا مظاہرہ نہ کرنا۔ تو حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ تینوں بزرگوں نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق بات کی۔

بڑے کی بڑائی کا خیال رکھنا چاہئے:

میں بات کر رہا تھا حدیث شریف کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے کی بڑائی کا حکم دیا ہے، اس پر بات چلی تھی اور بھی بہت سارے ارشادات ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جن میں یہ مضمون ذکر کیا گیا ہے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

”مَنْ لَّمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَلَمْ یُوَقِّرْ کَبِیْرَنَا وَلَمْ یُوْجِرْ عَالِمِیْنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔“

ترجمہ:......”جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی توقیر اور تعظیم نہ کرے اور ہمارے علمائ کا ادب نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

امورِ خیر میں ایثار کے فوائد:

تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بڑے کی بڑائی کا لحاظ رکھو! تو اس خیال سے کہ بزرگ آدمی ہے، یہ اگلی صف میں کھڑا ہوجائے گا، اس کی عبادت قبول ہوجائے گی، اس کی برکت سے ہماری بھی قبول ہوجائے گی۔ محققین کہتے ہیں کہ اس قسم کا ایثار جائز ہے، اس لئے کہ اس میں بڑے کی تعظیم وتوقیر ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

نیکی میں ایثار تواضع ہے:

دوسرا اس میں تواضع پائی جاتی ہے، بڑا آدمی پیچھے کھڑا ہو اور چھوٹا آگے کھڑا ہو تو ایک قسم کا کبر ہے اور جبکہ ہمیں تواضع کا حکم دیا گیا ہے۔

ایثار میں فنائیت ہے:

تیسرے اس میں اپنی عبادت پر نظر نہ کرنا اور اپنی عبادت کو ہیچ سمجھنا یہ بھی مضمون پایا جاتا ہے۔

نیکی کر کے ڈرنا چاہئے:

قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

”وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رَاجِعُوْنَ۔“ (المؤمنون:٦٠)

ترجمہ:......”اور وہ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل کانپ رہے ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔“

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”قَالَتْ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ ھٰذِہِ الاٰیَۃَ: ”وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ۔“ قَالَتْ عَائِشَۃُ: اَھُمُ الَّذِیْنَ یَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ وَیَسْرِقُوْنَ؟ قَالَ: لَا یَا بِنْتَ الصِّدِّیْقِ! وَلٰکِنَّھُمُ الَّذِیْنَ یَصُوْمُوْنَ وَیُصَلُّوْنَ وَیَتَصَدَّقُوْنَ وَھُمْ یَخَافُوْنَ اَلَّا یُقْبَلَ مِنْھُمْ۔“

(قرطبی ج:۱۲ ص:۸۹)

ترجمہ:......”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! کیا اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ گناہ کر کے وہ ڈرتے ہیں؟ فرمایا: نہیں! نہیں! بلکہ صدقہ اور خیرات کرتے ہوئے اور عبادت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ

ہماری لائی ہوئی عبادت قبول ہو یا نہ ہو، جس معیار کی عبادت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنی چاہئے ایسی عبادت ہم سے بن پڑے کہ نہ بن پڑے، خدا جانے یہ قابل قبول بھی ہے یا نہیں؟ اس بات سے کانپتے ہیں کہ ہم اپنے رب کے سامنے جائیں گے تو کیا منہ دکھائیں گے؟‘‘

امام غزالیؒ کی مغفرت کا سبب:

امام غزالی رحمہ اللہ کا قصہ لکھا ہے ناں! کسی نے وفات کے بعد ان کو دیکھا تو پوچھا: کیا گزری؟ کہنے لگے کہ: میری پیشی ہوئی، مجھ سے فرمایا کہ: ہمارے لیے کیا لائے ہو؟ میں نے کہا: یا اللہ! میں نے آپ کے دین کی طرف دعوت دینے کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں، بہت سے وعظ کئے، لوگوں کو آپ کی طرف بلایا، احیاءُ العلوم اور کیمیائے سعادت جیسی کتابیں لکھیں جو کہ آج بھی زندہ جاوید ہیں اور جن کے پڑھنے سے زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔ فرمایا گیا کہ: اس کا معاوضہ تو تمہیں وہاں مل گیا، لوگ تمہیں امام غزالی کہتے تھے، اسی لئے تو کہتے تھے ناں! اس کا معاوضہ تو تمہیں دنیا میں مل گیا، ہمارے لئے کیا لائے ہو؟ عرض کیا: یا اللہ! پھر میرے پاس تو اور کوئی عمل ایسا نہیں جو آپ کی بارگاہ کے لائق سمجھوں۔ فرمایا: تمہارا ایک عمل ہمارے پاس ہے، اس کی وجہ سے تمہاری بخشش کر دی اور وہ عمل یہ ہے کہ ایک دفعہ تم لکھ رہے تھے، تمہارے قلم پر ایک چیونٹی آگئی، تم نے قلم روک لیا اس خیال سے کہ شاید بے چاری پیاسی ہوگی، وہ روشنائی پی رہی تھی، جب تک وہ ہٹ نہیں گئی تم نے قلم استعمال نہیں کیا، تمہاری یہ نیکی ہمیں پسند آگئی کہ تم نے ہماری مخلوق پر شفقت کی، جاؤ تمہاری بخشش کرتے ہیں۔ تو آدمی کی اپنی عبادت پر نظر نہیں ہونی چاہئے۔

عبادت کی دو حیثیتیں:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ عبادت کی دو حیثیتیں ہیں، جو کام بھی ہم کرتے ہیں، نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں یا کوئی اور کام کرتے ہیں اس کی دو حیثیتیں ہیں،

ایک تو یہ کہ ہمارا فعل ہے اس حیثیت سے تو یہ لائق اعتبار ہی نہیں ہے، ہماری کوئی عبادت بھی لائق اعتبار نہیں ہے۔

اور ایک حیثیت اس کی یہ ہے کہ یہ تحفۂ خداوندی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں تحفہ ملا ہے، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے نماز پڑھ لی، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے روزہ رکھ لیا، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہم نے عبادت کرلی، یہ عطیاتِ الٰہیہ ہیں، تحفۂ خداوندی ہیں، اللہ تعالیٰ کے تحفے ہیں جو حق تعالیٰ شانہ اپنے بندوں کو مرحمت فرماتے ہیں، فرمایا اس لحاظ سے ہماری عبادتیں تمام کی تمام لائق قدر ہیں۔

اور پھر فرماتے ہیں کہ اگر پہلی حیثیت پر نظر کرو گے تو عبادت پر فخر پیدا ہوگا، اور فخر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول نہیں، مردود ہے، اور دوسری حیثیت پر نظر کرو گے تو شکر پیدا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے ہمیں توفیق عطا فرمادی۔

اہل جنت کا شکر:

چنانچہ جنتی جب جنت میں جائیں گے تو قرآن کریم میں ہے کہ کہیں گے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ۔" (الاعراف:۴۳)

ترجمہ:...... "اس اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم کو اس کی ہدایت عطا فرمادی، (جنت میں جانے کی،

جنت میں جانا تو اعمال کے ذریعہ سے ہے، ان اعمال کی ہدایت عطا فرمادی جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جنت میں پہنچادیا) اور ہم ایسے نہیں تھے کہ ہدایت پالیتے اگر اللہ ہمیں ہدایت عطا نہ فرماتے (اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہیں پاسکتے تھے، توفیق شامل حال نہ ہوتی تو نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، توفیق شامل حال نہ ہوتی تو مسجد میں نہیں آسکتے تھے)۔"

آنے نہیں دیتا:

وہ کہتے ہیں ناں! کہ ایک غلام تھا، ایک آقا تھا۔ غلام نیک آدمی تھا اپنے آقا سے کہنے لگا کہ: نماز کا وقت ہورہا ہے اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھ لوں؟ آقا نے کہا کہ: پڑھ لو! غلام نماز پڑھنے گیا تو تھوڑی سی دیر لگادی تو آقا باہر سے آواز دیتا ہے کہ: ابے آبھی جا! باہر کیوں نہیں آتا؟ غلام مسجد کے اندر سے کہتا ہے کہ: مجھے آنے نہیں دیتے۔ کہا: ابے تمہیں کون نہیں آنے دیتا؟ کہا: جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتا۔

نیکی پر ناز نہیں شکر چاہئے:

جن لوگوں سے اللہ تعالیٰ کام لیتے ہیں وہ ناز نہ کریں بلکہ شکر کریں جن سے کام لے رہے ہیں، جیسا بھی لے رہے ہیں وہ اس پر شکر بجالائیں، اگر عبادت کی اس حیثیت کو دیکھا جائے کہ یہ عطیۂ الٰہی ہے، عطیۂ خداوندی ہے، مالک کا عطیہ ہے کہ ہمیں سجدے کی توفیق عطا فرمادی، کہاں ہم اور کہاں اس کی پاک بارگاہ! اللہ اکبر! کوئی نسبت بھی ہے، ہم جیسے چماروں کو کون پوچھتا ہے؟ یہ مالک کا احسان ہے کہ ہمیں پکڑ کر اپنے دروازے پر جھکادیا کہ ہمارے سامنے سجدہ کرو، سبحان اللہ! کیا شفقت ہے، کیا عنایت ہے، کیا رحمت ہے، جہاں ملائکہ مقربین سربسجود ہوں اور جہاں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سجدے میں پڑے ہوئے ہوں، وہاں ہم جیسوں کو کون

پوچھتا ہے؟ اور ان کو کیا ضرورت ہے ہمارے سجدوں کی؟ لیکن کتنا کرم ہے، کتنا احسان ہے اور کتنی عنایت اور کتنا بڑا لطف ہے کہ جہاں ملائکہ سجدہ کر رہے ہیں، جہاں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سجدہ کر رہے ہیں، ہمیں کہہ دیا کہ تم بھی آجاؤ! آجاؤ آجاؤ! شاباش تم بھی شامل ہوجاؤ، تم بھی جماعت میں شامل ہوجاؤ:

اجازت ہو تو شامل میں بھی آ کے ان میں ہوجاؤں
سنا ہے کل تیرے در پر ہجومِ عاشقاں ہوگا!

شکر بجا لاؤ اللہ تعالیٰ کا کہ حق تعالیٰ شانہ نے جیسے بھی بری بھلی ہم سے پڑھی جاتی ہے یا اور کوئی نیکی کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمادی، ہاں! اچھی سے اچھی کرنے کی کوشش کرو، اپنے فعل پر ناز نہ کرو، بلکہ عطیۂ الٰہی پر شکر کرو۔

مالک کا لطف وکرم:

میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں تو بڑا مزہ آتا ہے، بڑا ہی مزہ آتا ہے، کیا مالک کی حکمت ہے، کیا مالک کی شان ہے اور کتنا مالک کا احسان ہے کہ ہمیں توفیق عطا فرمادی، ہم اس بارگاہ کے لائق تھے یا اللہ! ہمارا شمار بھی انسانوں میں ہونے لگا، یا اللہ! آپ نے ہمیں بھی آدمی سمجھ لیا، ہم تو حیوانوں سے بدتر تھے، کتنا کرم ہے آپ کا کہ آپ نے لاکے نہلا دھلا کر اپنی بارگاہ میں بلالیا اور کہا کہ: ہاں! سجدہ کرو ہمارے سامنے! اچھا ہمارے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوجاؤ! جھکو! مانگو کیا مانگتے ہو؟ دعائیں مانگ رہے ہیں، سجدہ کر رہے ہیں، نیاز کر رہے ہیں، عجز کر رہے ہیں، یہ سب مالک کے لطف وکرم کے عطا پر ہیں، تو خیر بحث اس پر چلی تھی کہ ایثار فی القرب جائز ہے کہ نہیں؟

عبادت میں ایثار پر کراہت کا قول:

علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس پر بحث کی ہے اور فرماتے ہیں کہ بعض اکابر

نے اس کو مکروہ کہا ہے کہ عبادت میں ایثار نہیں ہونا چاہئے، مثال میں نے دی ہے ناں! کہ پچھلی صف میں ایک بزرگ کھڑا تھا، اگلی صف کا ثواب زیادہ ہے تو پچھلی صف میں یہ چلا جائے اور اس کو آگے کردے۔

بعض اکابر نے کہا کہ نہیں! ایسا نہیں کرنا چاہئے جیسا وہ بندہ ہے ویسے یہ بندہ ہے، جیسے وہ محتاج ہے ثواب کا ویسے ہی یہ بھی محتاج ہے۔

عبادت میں ایثار پر محققین کا قول:

لیکن محققین کہتے ہیں کہ نہیں، کرنا چاہئے! اس لئے کہ اس صورت میں اپنی عبادت کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ قابل قبول ہو اور اللہ کے مقبول بندے کی عبادت کو لائق قبول اور قابل قبول سمجھتا ہے تو یہ تواضع ہے اور بزرگ داشت ہے، اس لئے اس میں ایثار کرنا چاہئے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

جذبہ ایثار

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کے پاس سواری نہیں ہے، کپڑا نہیں ہے، توشہ نہیں ہے، اس موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ: جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد کپڑا ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد توشہ ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، وہ صحابی فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ ہم لشکر والوں کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے پاس جو چیز بھی زائد ہو، اس میں ہمارا حق نہیں ہے، دوسروں کا حق ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ایک بزرگ ابوحفص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:
ایثار یہ ہے کہ دنیا اور آخرت کے فوائد میں اپنے نفس پر دوسرے بھائیوں کو مقدم کیا جائے۔ اور بعض اوقات انہوں نے یہ فرمایا کہ دنیا کی منفعت تو بہت قلیل ہے، دنیا کے معاملہ میں کسی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینا یہ تو معمولی بات ہے، ایثار یہ ہے کہ: آخرت کے معاملہ میں دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دی جائے۔

ایک بزرگ کے ایثار کا قصہ:

ایک بزرگ سے ان کے دوست کی ملاقات ہوئی، تو انہوں نے ان کے ساتھ خندہ پیشانی کا مظاہرہ نہیں کیا، جیسا پرتپاک ملنا چاہیئے، ویسے نہیں ملے، ان کے دوست نے شکایت کی تو فرمانے لگے کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی سنا ہے:

ترجمہ:...... ”جب دو بھائی آپس میں ملیں تو ان میں سے جو شخص زیادہ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرے اس کو دس گنا

ثواب ملتا ہے، اور جو کم کرے اس کو ایک ثواب ملتا ہے۔ تو میرا جی چاہا کہ آپ کا ثواب مجھ سے بڑھ جائے، اس لئے میں نے کم خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا، تاکہ میرا ثواب آپ سے نہ بڑھے، بلکہ آپ کا ثواب مجھ سے بڑھ جائے۔"

ایثار کی تعریف:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایثار یہ ہے کہ: اپنے حقوق پر دوسرے کے حقوق کو مقدم کیا جائے، اور اس میں عزیز، قریب، رشتہ دار، دوست احباب، جان پہچان والے یا دوسرے لوگ جن کے ساتھ جان پہچان نہیں، ان کے درمیان امتیاز نہ کیا جائے، بلکہ ہر کس و ناکس جو بھی ہو، اس کے حقوق کو اپنے حقوق پر مقدم کرنا یہ ایثار ہے۔

دوستی اور قرابت کی پاسداری ایثار نہیں:

وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر آپ قرابت، دوستی اور تعلق کی بنا پر دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں، تو یہ جو دوستی اور قرابت درمیان میں آگئی، اگرچہ پہلے قرابت کے حقوق ادا کرنا یہ بھی حکم خداوندی کی بنا پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے دوستی رکھنا یہ بھی رضاءِ الٰہی کے لئے ہے، لیکن حقوق ادا کرتے ہوئے درمیان میں رشتہ داری کا آجانا، قرابت کا آجانا، دوستی کا آجانا اس میں اخلاص نہیں رہتا۔ مسئلہ تو اس شخص کے بارے میں ہے کہ جس کے ساتھ ہماری کوئی جان پہچان نہیں ہے، کوئی تعلق اس کے ساتھ نہیں ہے، اس کے حقوق کو ادا کرنا محض اللہ کی خاطر یہ ایثار ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ مکارم اخلاق کے بارے میں بیان فرما رہے تھے، اسی کے ضمن میں فرمایا:

"وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ عَرَفۡتَ وَمَنۡ لَّمۡ تَعۡرِفۡ۔"

(مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:...... ''سب کو سلام کہنا (سلام کہنے میں ابتدأ کرنا) چاہے اس شخص کے ساتھ جان پہچان ہو یا جان پہچان نہ ہو۔''

ایک صوفی کے ایثار کا قصہ:

ایثار کا یہ سب سے عالی مرتبہ ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا، محض رضائے الٰہی کے لئے دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا یہ ایثار ہے۔

ایک بزرگ تھے، ان کے ساتھ صوفیوں کی ایک جماعت تھی، اپنے ایک دوست کے گھر پر گئے، دیکھا کہ گھر پر تالا لگا ہوا ہے، فرمانے لگے: صوفی کے گھر میں تالا؟ ماشأاللہ! توڑ دو اس تالے کو، تالا توڑ دیا اور مکان کا سارا سامان بازار میں بکوادیا، وہ صوفی جی کہیں گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو دیکھا کہ شیخ بیٹھے ہیں، ان کے ساتھ مہمان بھی بیٹھے ہیں، ان کی اہلیہ کا ایک کمبل تھا جو اس نے اپنے اوپر لیا ہوا تھا، واپسی پر وہ بھی اتار کر شیخ کے پاس بھیج دیا اور کہا کہ: یہ بھی گھر کے سامان میں تھا، فروخت ہونے سے رہ گیا ہے۔ ان کے شیخ کہنے لگے کہ: اس کے بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، یہ تو تم اپنے پاس رکھ لیتے! ان کی اہلیہ کہنے لگیں کہ: اتنے بڑے بزرگ ہیں جو ہمارے گھر میں تصرف کر رہے ہیں، گھر کا سامان بیچ رہے ہیں، تو ایک چیز ان سے کیوں چھپا کر رکھی جائے؟ یہ ہمارے لئے بڑی سعادت اور برکت ہے کہ اتنے بڑے بزرگ، ہمارے گھر میں مالکانہ تصرف کر رہے ہیں، یہ ہے ایثار!

یمن کے اشعریوں کا ایثار:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعریوں کی تعریف فرمائی، قبیلہ اشعر یمن کا ایک قبیلہ تھا، یہ قبیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا قبیلہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حاضری سے بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ:

’’اَ لْاِیْمَانُ یَمَانِیٌّ وَالْحِکْمَةُ یَمَانِیَّةٌ۔‘‘

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۵۲)

ترجمہ:......’’ایمان بھی یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔‘‘

اہل یمن کی بہت تعریف فرمائی ہے۔ تو ایک موقع پر ان کی تعریف فرماتے ہوئے فرمایا: یہ اشعری لوگ جب جہاد میں ہوں اور ان کو فقر و فاقہ لاحق ہوجائے یا ان کے توشے کم ہوجائیں، تو یہ ایسا کرتے ہیں کہ سب کے توشے ملاکر ایک کپڑے میں جمع کردیتے ہیں، اور پھر سب میں برابر تقسیم کردیتے ہیں، حالانکہ کسی کے پاس زیادہ ہوگا اور کسی کے پاس کم، تو سارے توشے اکٹھے کرلو اور اکٹھے کرکے ان کو برابر برابر تقسیم کرلیا کرو۔

ایثار کی تلقین:

ایک موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد میں دیکھا کہ کچھ لوگوں کے پاس سواری نہیں ہے، کپڑا نہیں ہے، توشہ نہیں ہے، اس موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور اس میں ارشاد فرمایا کہ: جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد کپڑا ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، جس کے پاس زائد توشہ ہو وہ اپنے بھائی کو دے دے، وہ صحابی فرماتے ہیں کہ یہاں تک کہ ہم لشکر والوں کو یہ خیال ہوا کہ ہمارے پاس جو چیز بھی زائد ہو، اس میں ہمارا حق نہیں ہے، دوسروں کا حق ہے۔

حضرت زینبؓ کو ایثار کی تلقین:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا قصہ تو بہت مشہور ہے، غالباً حجۃ الوداع سے واپسی کا قصہ ہے کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی سواری کا اونٹ بیمار ہوگیا تھا، تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ: تم اپنا اونٹ اپنی بہن صفیہ کو دے دو! اس لئے کہ ان کے پاس زائد ہوگا، چونکہ سوکنوں کی آپس میں چلتی رہتی ہے، اس لئے انہوں نے کہا کہ: میں اس یہودن کو دوں گی؟

حضرت صفیہؓ کا خواب اور یہودی کی تعبیر:

اس لئے کہ حُی بن اختر خیبر کا رئیس تھا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا اس کی صاحبزادی تھیں، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ایک شخص کے نکاح میں تھیں، وہ یہودی تھا، اس سے ایک دن خواب بیان کیا کہ: میں نے بڑا عجیب وغریب خواب دیکھا ہے، وہ کہنے لگا: کیا خواب دیکھا ہے؟ اور کب دیکھا؟ کہنے لگیں کہ: آسمان سے چاند ٹوٹا اور میری گود میں آگیا۔ اس نے ایک زور سے تھپڑ مارا اور کہنے لگا کہ: تم یثرب کے نبی سے نکاح کرنا چاہتی ہو؟ کیسے غضب کی تعبیر دی اس نے! چنانچہ بعد میں یہی ہوا کہ آپ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔

پھر ایک اور موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ عورتیں مجھے طعنہ دیتی ہیں کہ تو یہودی کی بیٹی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم تو نبی کی بیٹی ہو، حضرت ہارون علیہ السلام کی بیٹی ہو، حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے تھی۔ تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: میں اس یہودن کو اپنا اونٹ دوں گی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا یہ جواب ناگوار گزرا اور آپ نے ان سے قطع تعلق کرلیا، ان کی باری میں ان کے پاس تشریف نہیں لے جاتے تھے، بول چال بند کردی تھی، ذوالحجہ، محرم، صفر ان تین مہینوں

تک بول چال بند رہی، صفر کے آخر میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس قصہ کو خود بیان فرماتی ہیں کہ: میں اپنے گھر میں بیٹھی تھی، اتنے میں میں نے ایک آدمی کا سایہ بڑھتا ہوا دیکھا، میں سوچنے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو میرے پاس تشریف نہیں لاتے، یہ کون آدمی ہوسکتا ہے؟ چند لمحوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، وہاں ایک چارپائی کھڑی تھی، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بچھایا اور اس پر تشریف فرما ہوئے، اور اپنے گھر والوں سے صلح کرلی۔

دینی امور میں تین دن سے زیادہ قطع تعلق:

اس سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان بھائی سے کسی دینی وجہ کی بنا پر تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرنا جائز ہے، اور یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تین دن سے زیادہ قطع تعلق نہ رکھے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ دنیا کی رنجش آپس میں ہو، جن دو آدمیوں کے درمیان دنیاوی رنجش ہو، تین دن تک تو غصہ رکھے، تین دن کے بعد چھوڑ دے۔

قطع تعلق کا وبال:

حدیث شریف میں فرمایا کہ:

"تُفْتَحُ اَبْوَابُ الْجَنَّةِ كُلَّ يَوْمِ اثْنَيْنِ وَخَمِيْسٍ فَيُغْفَرُ فِىْ ذٰلِكَ الْيَوْمَيْنِ لِكُلِّ عَبْدٍ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا، اِلَّا مَنْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اَخِيْهِ شَحْنَاءُ، فَيُقَالُ اُنْظُرُوْا هٰذَيْنِ حَتّٰى يَصْطَلِحَا۔"
(ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:......"ہر پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، اور بندوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، اور امت کی بخشش کی جاتی ہے، سوائے ان دو

آدمیوں کے جن کے درمیان رنجش ہو، ان کی بخشش نہیں ہوتی، حق تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو چھوڑ دو جب تک یہ آپس میں صلح نہ کرلیں۔"

مسند احمد اور طبرانی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

ترجمہ:......"جن دو مسلمانوں کے درمیان رنجش ہو اور رنجش تین دن سے زیادہ رہے اور بول چال بند رہے، وہ دونوں دوزخ میں ہیں جب تک وہ صلح نہ کرلیں۔

ایک حدیث میں فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ اَنْ یَّھْجُرَ اَخَاہُ فَوْقَ ثَلٰـثَةِ اَیَّامٍ، یَلْتَقِیَانِ فَیُعْرِضُ ھٰذَا وَیُعْرِضُ ھٰذَا وَخَیْرُھُمَا الَّذِیْ یَبْدَأُ بِالسَّـلَامِ۔" (ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:......"کسی مسلمان کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے، سلام و کلام بند رکھے، اگر دونوں کی اچانک ملاقات ہوجائے تو وہ ادھر منہ پھیرلے اور یہ ادھر منہ پھیرلے، اور ان میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو ابتداً بالسلام کرے، سلام کرنے میں ابتداً کرے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"لَا یَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّھْجُرَ مُؤْمِنًا فَوْقَ ثَـلَاثٍ، فَاِنْ مَرَّتْ بِہٖ ثَـلَاثٌ فَلْیَلْقَهٗ فَلْیُسَلِّمْ عَلَیْہِ، فَاِنْ رَدَّ عَلَیْہِ السَّـلَامَ فَقَدِ اشْتَرَکَا فِی الْاَجْرِ، وَاِنْ لَّمْ یَرُدَّ عَلَیْہِ فَقَدْ بَاءَ بِالْاِثْمِ۔" (ابوداؤد ص:۳۱۷)

ترجمہ:......’’کسی مؤمن کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے مؤمن بھائی سے تین دن سے زیادہ رنجش رکھے، جب تین دن گزر جائیں تو اس کو چاہئے کہ وہ جا کر سلام کہے، اگر وہ سلام کا جواب دے دے تو دونوں اجر میں شریک ہوگئے، اور اگر اس نے سلام کیا اور دوسرے نے سلام کا جواب نہیں دیا تو پورے کا پورا وبال اس پر جا پڑے گا، اور یہ قطع تعلق اور سلام و کلام بند کرنے کے وبال سے بری ہوجائے گا۔‘‘

تو یہ احادیث اور اس قسم کی اور بہت سی احادیث قطع تعلق کے سلسلہ میں ہیں، میں نے چند احادیث بطور نمونہ پیش کی ہیں، یہ اس صورت میں ہے جبکہ کسی دنیوی معاملے کی وجہ سے رنجش ہوجائے۔

دین کے لئے قطع تعلق کا جواز:

لیکن اگر رنجش کی بنیاد کوئی دینی مسئلہ ہو تو تین سے زیادہ قطع تعلق جائز ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ:

’’لَا تَمْنَعُوْا نِسَاءَكُمُ الْمَسَاجِدَ وَبُيُوْتُهُنَّ خَيْرٌ لَّهُنَّ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۹۶)

ترجمہ:......’’(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:) اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں آنے سے روکا نہ کرو، ان کا اپنے گھر پر نماز پڑھنا، مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔‘‘

عورتیں نہ مانتی ہیں اور نہ سمجھتی ہیں:

لیکن عورتیں بے چاری اس مسئلے کو نہیں سمجھتیں، اور مانتی بھی نہیں ہیں، مکہ شریف اور مدینہ شریف میں ان سے کہا جائے کہ تم گھر پر نماز پڑھا کرو، تمہیں یہاں

پورا اجر ملے گا، مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نہ جایا کرو۔ تو کہنے لگتی ہیں کہ پھر یہاں آنے کا فائدہ کیا ہے؟ نہیں مانتیں، اچھا نہ مانو، تمہاری مرضی ہے۔ حالانکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت اور مسجد نبوی ﷺ میں، اور اپنے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: عورت کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا، مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور یہ کہتی ہیں کہ کیا فائدہ ہے؟

تو عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ترغیب دی ہے کہ وہ اپنے گھر پر نماز پڑھا کریں۔ لیکن مردوں کو فرمایا ہے کہ تم ان کو روکو نہیں، اگر مسجد میں آنا چاہتی ہیں، تو تم نہ روکو، آپ صلی اللہ علیہ سلم نے ان کو خود روکا، مگر مردوں کو کہہ دیا کہ تم نہ روکو۔

حضرت عمرؓ کی ترکیب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نماز پڑھنے کے لئے جاتی تھیں، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ روکو نہیں، اس لئے روک تو سکتے نہیں تھے، لیکن غیرت بہت آتی تھی، ایک دن راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے اور جب وہ پاس سے گزری (پہچانتے تھے) تو چادر کا کنارہ ذرا سا پکڑ کر کھینچ دیا، اگلے دن جب نماز کے لئے جانے کا وقت ہوا تو فرمانے لگے کہ نماز کے لئے نہیں جانا؟ کہنے لگیں: نہیں! میں تو گھر پر ہی پڑھوں گی۔ اس تجویز سے ان کو روکا، لیکن چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ ان کو روکو نہیں، اس لئے زبان سے نہیں کہا کہ مت جایا کرو!

تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ بیان فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کے گھروں میں آنے سے نہ روکو! ان کے صاحبزادے حضرت بلالؒ تھے، وہ کہنے لگے کہ: "وَاللّٰہِ! لَا نَأْذَنُ لَھُنَّ فَیَتَّخِذْنَہٗ دَغَلًا۔" (ابوداؤد ص:۸۴) (اللہ کی قسم ہم تو روکیں گے، اس لئے کہ عورتیں اس کو فساد کا ذریعہ بنالیں گی) حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ عنہ ان پر برہم ہوئے، اور فرمانے لگے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تم سے بیان کرتا ہوں، اور تو اس کے مقابلے میں کہتا ہے کہ ہم روکیں گے؟ اللہ کی قسم! زندگی بھر تجھ سے بات نہیں کروں گا، اور اگر تو میری زندگی میں مرگیا تو تیرے جنازے میں شریک نہیں ہوں گا، چنانچہ جب ان کی زندگی میں بیٹے کا انتقال ہوا، تو وہ اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے۔

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کا اپنے بھتیجے سے بائیکاٹ:

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بھتیجے کنکریوں سے کھیلتے تھے، کیونکہ اس وقت عرب میں کنکریوں کا کھیل ہوتا تھا، انہوں نے اس کو بلایا اور کہا: بھتیجے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ اس سے منع فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے نہ تو دشمن کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ شکار کیا جاسکتا ہے، یہ کنکری کسی کی آنکھ میں لگ سکتی ہے، اور کسی کی آنکھ پھوٹ سکتی ہے، اس لئے نہ کھیلا کرو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چونکہ وہ بچہ تھا، ذہن میں بات نہیں بیٹھی، انہوں نے اسے دوبارہ کھیلتے ہوئے دیکھ لیا، اس کو بلاکر کہا کہ: میں نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنایا تھا، تو نے کھیلنا بند نہیں کیا، اللہ کی قسم! ساری زندگی تم سے بات نہیں کروں گا۔

حضرت عائشہؓ کا اپنے بھانجے سے قطع تعلق:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بہت سخاوت کرتی تھیں، ایک وقت میں ایک ایک لاکھ درہم بھی تقسیم فرمائے، ایک دفعہ مال کا ڈھیر کسی نے بھیج دیا، آپ نے تقسیم کروانا شروع کردیا، گھر کی خادمہ نے کہا کہ حضرت! آپ کا روزہ تھا، شام کو روزہ افطار کرنے کے لئے ہی کچھ رکھ لیتیں! فرمانے لگیں کہ پہلے بتاتی، اب عورتوں کی طرح طعنہ دینے کا کیا فائدہ؟ اب تو ختم ہوچکا ہے۔

ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ تھے، ان کو انہوں نے بیٹا بنایا ہوا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر ان کی کنیت ام عبداللہ رکھی تھی، یعنی اسی حضرت عبداللہؓ کے نام پر ام عبداللہ تھیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، تو یہ داد و دہش کرتی تھیں، ایک مرتبہ حضرت عبداللہؓ کے منہ سے نکل گیا کہ میں خالہ کو روکوں گا، ان کو بلایا اور بلا کے کہا: تیری یہ جرأت ہوگئی، تو یہ کہتا ہے کہ میں روکوں گا!؟ جا اللہ کی قسم! ساری عمر تم سے بات نہیں کروں گی۔ چنانچہ کئی مہینہ بات نہیں کی اور حضرت عبداللہؓ صحابی بھی ہیں، اور ''اول مولود ولدفی المدینة۔'' (یہ مہاجرین کا وہ سب سے پہلا بچہ تھا جو مدینہ میں پیدا ہو)، یہ بہت پریشان ہوئے، گھر آنے کی اجازت مانگتے تھے، مگر گھر آنے کی اجازت نہیں ملتی تھی، ایک دن انہوں نے حضرت عائشہؓ کے کچھ دوسرے محرم عزیزوں سے کہا کہ: تم لوگ اجازت لو، میں بھی تمہارے ساتھ چلا جاؤں گا، اور تم میری سفارش کرنا، میں خالہ کی منت سماجت کروں گا، وہ اپنی قسم توڑ دیں، چنانچہ اس قرارداد کے مطابق وہ رشتہ دار ان کو ساتھ لے گئے، انہوں نے جس وقت اجازت لی تو حضرت عبداللہؓ کا نام نہیں لیا، حضرت ام المؤمنین نے انہیں اندر آنے کی اجازت دے دی، ان کے ساتھ یہ بھی چلے گئے، اور جا کر خالہ سے لپٹ گئے اور بے تحاشہ رونے لگے، پاؤں پکڑتے تھے، لپٹتے تھے، ان لوگوں نے بھی سفارش کی، حضرت عائشہؓ نے تو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا، وہ بھی بہت روئیں، بالآخر اپنی قسم توڑ دی اور اس قسم توڑنے پر نہ معلوم کتنے غلام آزاد کئے، بعد میں ہمیشہ رویا کرتی تھیں کہ میری قسم تڑوادی۔

تو کسی دنیاوی وجہ کی بنا پر اگر قطع تعلق کیا ہو تو تین دن سے زیادہ قطع تعلق اور سلام و کلام بند کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر دینی وجوہ کی بنا پر سلام و کلام بند کیا ہو تو جائز ہے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینبؓ سے ایک لفظ کی بنا پر قطع تعلق فرمایا، لیکن بعد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کرلی، کیونکہ دنیا سے

تشریف لے جانے کا وقت قریب آ گیا تھا، تقریباً کوئی آٹھ یا دس دن کے بعد آپؓ کا انتقال ہوگیا تھا۔ آپؓ نے مناسب نہیں سمجھا کہ یہ داغ ان بیچاریوں پر ہمیشہ کے لئے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ناراض گئے ہیں۔

مقبولانِ الٰہی کی رضا سعادت ہے:

اللہ کے مقبول بندوں کا کسی سے خوش ہوکر جانا، یہ بڑی سعادت کی بات ہے، اور اللہ کے مقبول بندوں کا کسی سے ناراض ہوکر جانا یہ بڑی بدبختی کی بات ہے۔ آخری وقت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ رو رہے تھے، صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے، تسلی دی اور کہنے لگے کہ: تمام عمر آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں، اور جب دنیا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے تو آپ سے راضی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں رہے ہیں، اور ان کی رفاقت کا حق آپ نے ادا کیا ہے، اور جب وہ دنیا سے تشریف لے گئے ہیں وہ بھی آپ سے راضی تھے۔

آپ ﷺ کا سایہ تھا:

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہ جو مشہور ہے ناں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا، یہ روایت غلط ہے۔ مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور کے بنے ہوئے تھے، اور نور کا سایہ نہیں ہوتا، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ بھی نہیں تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کی کتابوں میں یہ بات لکھی ہے، لیکن نہایت غلط بات ہے، یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہیں تھا، قطعاً غلط ہے، یہ صحیح حدیث حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی میں نے جو ذکر کی، یہ بتاتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی، میں نے ایک شخص کا سایہ بڑھتے ہوئے دیکھا، میں نے کہا کہ یہ کون آدمی ہوسکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس

تو تشریف نہیں لاتے، دوسرا کون آدمی میرے پاس آسکتا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ سایہ تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ کا نہ ہونا عقلاً بھی غلط ہے:

دوسرا میں کہتا ہوں کہ یہ عقلاً بھی غلط ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ ہو، اس لئے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی برہنہ بدن نہیں ہوئے کہ بدن مبارک پر کپڑا نہ ہو، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے جاتے ہوں گے تو آپ کے بدن پر تو کپڑا ہوتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ اگر نہ ہو تو کپڑے کا تو سایہ ہونا چاہئے ناں! ہاں اگر یوں کہو کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر کپڑوں کے بغیر پھرتے رہے اور آپ چونکہ نور تھے، اس لئے نور کا سایہ نہیں ہوتا تو پھر ہم مان لیں گے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور ہونے کا مطلب:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے، اگر کسی نے یہ مطلب سمجھا ہے کہ نور تھے اور نور کا سایہ نہیں ہوتا، تو یہ مطلب صحیح نہیں ہے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم سراپا نور تھے، ہمارا بھی ایمان ہے، لیکن یہ نور آپ کے انسان ہونے کے اور گوشت پوست ہونے کے منافی نہیں تھا، بلکہ گوشت پوست میں بھی نور بھرا ہوا تھا۔ چنانچہ ایک حدیث میں اس کی بہت زیادہ تفصیل آتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

”اَللّٰھُمَّ اجعَلُ فِیُ قَلُبِیُ نُوُرًا وَّفِیُ بَصَرِیُ نُوُرًا وَّفِیُ سَمُعِیُ نُوُرًا وَّعَنُ یَّمِیُنِیُ نُوُرًا وَّعَنُ شِمَالِیُ نُوُرًا وَّخَلُفِیُ نُوُرًا وَّمِنُ اَمَامِیُ نُوُرًا وَّاجُعَلُ لِّیُ نُوُرًا وَّفِیُ عَصَبِیُ نُوُرًا وَّفِیُ لَحُمِیُ نُوُرًا وَّفِیُ دَمِیُ نُوُرًا وَّفِیُ شَعُرِیُ نُوُرًا وَّفِیُ بَشَرِیُ نُوُرًا وَّفِیُ لِسَانِیُ نُوُرًا وَّاجُعَلُ فِیُ نَفُسِیُ

نُوْرًا وَّاَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِیْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا۔"

(صحیح مسلم ج:۲ ص:؟؟؟)

ترجمہ:......''یا اللہ میرے دل میں نور پیدا فرمادے، میری آنکھوں میں نور، میرے کانوں میں نور، میرے دائیں نور، میرے بائیں نور، میرے پیچھے نور، میرے آگے نور، اور یا اللہ میرے لئے نور کردیجئے، میرے پٹھوں میں نور، میرے گوشت میں نور، میرے خون میں نور، میرے بالوں میں نور، میرے چمڑے میں نور، میری زبان میں نور اور میری جان میں نور اور مجھے عظیم نور دیجئے اور میرے اوپر نور، اور میرے نیچے نور، یا اللہ مجھے نور عطا فرما۔''

تو یہ بجائے خود صحیح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز نورانی تھی، ہر چیز میں نور تھا، رگ و پے میں نور سرائیت کیے ہوئے تھا، لیکن یہ وہ نور نہیں تھا جس کو تم نور سمجھے ہو اور جو سایہ ہونے کے منافی ہے، اس نور کی حقیقت کو ہم اور آپ سمجھ ہی نہیں سکتے، وہ کیا چیز ہے؟ بہرکیف تو یہ قطع تعلق کے درمیان میں بات آگئی تھی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو ایثار کی تلقین:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا، اور اس میں فرمایا کہ اے مہاجرین و انصار کی جماعت! تم میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس مال نہیں ہے، کوئی توشہ نہیں ہے، تو میرا جی چاہتا ہے کہ کسی کے پاس اگر ایک آدمی کی گنجائش ہو تو اپنے ساتھ ایک آدمی کو ملالے، اگر دو کی گنجائش ہے تو دو کو ملالے، اور اگر تین کی گنجائش ہو تو تین کو ملالے، ایک ایک، دو دو، تین تین، کرکے ان تمام حضرات کو صحابہ کرام نے آپس میں تقسیم کرلیا، صحابہ کرامؓ

ان کو کھلاتے تھے اور خود بھوکے رہتے تھے، کھانا وغیرہ ان کو کھلاتے تھے، ان کو مقدم رکھتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں۔

ایثارِ صحابہؓ کا ایک قصہ:

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان دس صحابہؓ میں سے ہیں جن کو جنت کی بشارت دی گئی تھی، نہایت مالدار صحابہؓ میں شمار ہوتے تھے (حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما)، کہتے ہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی چار بیویاں تھیں، اور مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک بیوی ہو تو اس کو آٹھواں حصہ ملتا ہے، اور اگر ایک سے زائد ہوں تو وہ سب کی سب اسی آٹھویں حصہ میں شریک ہوتی ہیں۔ تو ایک بیوی کا حصہ بتیسواں حصہ ہوا، غالبًا اسّی ہزار میں یا کتنے میں ایک بیوی نے وارثوں سے صلح کرلی تھی کہ مجھے اتنے پیسے دے دیں، میں اپنی وراثت کا حق چھوڑتی ہوں۔ جب یہ مدینہ طیبہ آئے ہیں تو کوئی چیز پاس نہیں تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارہ قائم کردیا تھا، یعنی ایک انصاری کو ایک مہاجر کا بھائی بنادیا تھا، چونکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بھائی چارہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا، حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ ان کو اپنے گھر لے گئے، اور لے جاکر کہنے لگے کہ دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو بھائی بنادیا ہے، اب میرے پاس جو کچھ بھی ہے، میری ملکیت مکان ہے، زمین ہے اور جو کوئی چیز ہے، ان سب میں تمہارا آدھا حصہ ہے، تم میرے بھائی بنادیئے گئے ہو، میری دو بیویاں ہیں، ان میں سے جو تمہیں اچھی لگے، میں اس کو طلاق دیتا ہوں، تم عدت کے بعد اس کے ساتھ شادی کرلو، اور آدھا مکان تم کو تقسیم کرکے دیتا ہوں، آدھی زمین تم کو تقسیم کرکے دیتا ہوں، ان کے اس اخلاص اور ان کی اس محبت کو دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا

کہ: ”بَارَکَ اللہُ لَکَ فِیۡ اَھۡلِکَ وَمَالِکَ، دُلَّنِیۡ عَلَی السُّوۡقِ۔“ (اللہ تعالیٰ تمہارے اہل اور تمہارے مال میں برکت فرمائے، مجھے بازار کا راستہ بتاؤ، میں کما کے کھاؤں گا)۔ غالبًا انہوں نے ایک دینار کسی سے قرض لے لیا اور اس کے ساتھ تجارت کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں برکت فرمائی، چند دنوں میں انہوں نے نکاح بھی کرلیا، ان کے کپڑے کو کوئی رنگ وغیرہ لگ گیا تھا، رنگ عورتیں لگاتی ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”اَعَرَسۡتَ؟“ کیا تم نے شادی کرلی ہے؟ کہا کہ: جی ہاں! فرمایا: ”اَوۡلِمۡ وَلَوۡ بِشَاۃٍ۔“ ولیمہ کرو چاہے تم کو بکری ذبح کرنی پڑے، ولیمہ کرو، ولیمہ کھلاؤ۔

بزرگانِ دین اور صوفیوں کا اصول:

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایثار کا یہ جذبہ پیدا کردیا تھا، اور اس کے بعد حضرات اہل رشد، صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کے اندر یہ وراثت منتقل ہوئی اور صوفیوں کا مقولہ ہے، جو ان کا متفقہ علیہ ہے، جس کے بارے میں شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ: ہرچہ درویشان است وقف محتاجان است۔ جو کچھ درویشوں کے پاس ہے وہ محتاجوں کے لئے وقف ہے، وہ اس کی اپنی نہیں، صوفیا فرماتے ہیں جو شخص کسی چیز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہو کہ میں اس کے استعمال کا حق دار ہوں، دوسرا نہیں ہے، وہ صوفی نہیں ہے، یہ ہمارے قبیلے سے خارج ہے، کیونکہ ہرکہ کشتہ نیست از قبیلہ ما نیست، جس کا نفس نہیں مرا، اس کے اندر ”میں“ باقی ہے، وہ ہمارے قبیلہ سے نہیں ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

حکمت و دانائی

آدمی کی عقل کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ یہ دیکھو کہ وہ کن امور میں حصہ لیتا ہے؟ اور اس کے اخلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس حیثیت کا آدمی ہے؟ لہٰذا گھٹیا امور سے پرہیز کرو اور اسی طرح پتلے قسم کے اخلاق اور گھٹیا اخلاق سے پرہیز کرو، تمہارے اخلاق جس قدر بلند ہوں گے اسی سے تمہاری قدوقامت کا، تمہاری عقل کا، تمہاری فہم کا، تمہارے شعور کا اندازہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيّ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: كَتَبَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اِلٰى اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: اَنَّ الْحِكْمَةَ لَيْسَتْ عَنْ كِبَرِ السِّنِّ وَلٰكِنَّهٗ عَطَاءُ اللهِ يُعْطِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ، فَاِيَّاكَ وَدَنَائَةَ الْاُمُوْرِ وَمَدَاقَ الْاَخْلَاقِ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۳۸۱)

”عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اَنَّهٗ كَتَبَ اِلٰى اِبْنِهٖ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: اَمَّا بَعْدُ! فَاِنِّيْ اُوْصِيْكَ بِتَقْوَى اللهِ فَاِنَّهٗ مَنِ اتَّقَى اللهَ وَقَاهُ، وَمَنْ تَوَكَّلَ عَلَيْهِ كَفَاهُ، وَمَنْ اَقْرَضَهٗ جَزَاهُ، وَمَنْ شَكَرَهٗ زَادَهٗ، وَلْتَكُنِ التَّقْوٰى نُصْبَ عَيْنَيْكَ، وَعِمَادَ عَمَلِكَ، وَجِلَاءَ قَلْبِكَ فَاِنَّهٗ لَا عَمَلَ لِمَنْ لَّا نِيَّةَ لَهٗ، وَلَا اَجْرَ لِمَنْ لَّا حَسْبَةَ لَهٗ، وَلَا مَالَ لِمَنْ لَّا رِفْقَ لَهٗ، وَلَا جَدِيْدَ لِمَنْ لَّا خَلَقَ لَهٗ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۸۹)

ترجمہ:......"حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ:
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، اس میں تحریر فرمایا کہ: بے شک حکمت عمر کے زیادہ ہونے سے نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو چاہتے ہیں عطا فرمادیتے ہیں، گھٹیا امور سے اور کمزور اخلاق سے بچتے رہا کرو۔"

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: میں تم کو وصیت کرتا ہوں اللہ سے ڈرنے کی، اس لئے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کو بچالیتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی کفالت فرماتے ہیں، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض دے اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ عطا فرماتے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اللہ تعالیٰ اس کو مزید عطا فرماتے ہیں، اس لئے چاہئے کہ تقویٰ تمہارا نصب العین ہو، تمہارے عمل کا ستون اور تمہارے دل کی روشنی ہو، اس لئے کہ عمل معتبر نہیں اس شخص کا جس کی کوئی نیت نہیں اور اجر نہیں اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ثواب کی خاطر کام نہ کرے، اور مال نہیں اس شخص کا جس کے ساتھ لوگوں کی ہمدردی کرنا نہیں، اس شخص کے لئے نیا نہیں ملتا جس کے لئے پرانا نہ ہو۔"

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو خط ہیں، ایک حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے کوفہ اور بصرہ کے گورنر تھے)،

دوسرا خط حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے نام ہے (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمّال اور گورنروں کے نام مختلف قسم کے خطوط جاری فرماتے رہتے تھے، امام مالکؒ نے ان کے متعدد خطوط نقل کئے ہیں اور بعض حضرات نے تو خطوط تلاش کرکر کے اس پر مکمل کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سرکاری خطوط اور اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نامہ ہائے گرامی۔

حکمت و دانائی عطیۂ الٰہی ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو نامہ گرامی تحریر فرمایا اس میں یہ بات بھی تحریر فرمائی کہ: حکمت اور دانائی عمر کے بڑے ہونے کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت یحیٰ علیہ السلام کو ہم نے حکمت عطا فرمادی تھی بچپن میں۔ (وَاٰتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا) (مریم:۱۲)

بعض اکابرؒ نے کہا کہ یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے اور ان کو بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمادی تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکمت:

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما الصلوٰۃ والسلام کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نقل کیا ہے کہ ان کی خدمت میں ایک مقدمہ آیا، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام عمر میں چھوٹے تھے، یعنی نابالغ تھے، حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی صوابدید پر مقدمے کا فیصلہ کردیا، مقدمہ یہ تھا کہ دو عورتیں تھیں، ان میں سے ایک کے بچے کو بھیڑیا لے گیا تھا، اور صرف ایک بچہ رہ گیا، اب ان دونوں عورتوں کا

اس بچہ پر دعویٰ تھا، حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں مقدمہ آیا تو انہوں نے ان دونوں عورتوں میں سے جو عمر میں بڑی تھی اس کے حق میں فیصلہ کردیا۔ بڑی عورت بچہ لے گئی، جب دونوں عورتیں عدالت سے باہر نکلیں تو حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام، جو کہ ابھی بچے تھے، وہاں تشریف فرما تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک بچاری روتی جارہی ہے اور ایک ہنستی جارہی ہے، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ کیا قصہ ہوا؟ لوگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ یہ شہزادہ ہے اس کو یہ واقعہ بتانا چاہیئے، لوگوں نے یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بیان کردیا، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمانے لگے کہ فیصلہ میں کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے، شاید تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے بیانات نہیں دیئے ہوں گے۔ اگر تم کہو تو میں فیصلہ کردوں، میں فیصلہ ایسا کروں گا کہ دونوں راضی ہوجائیں گی، لوگ کہنے لگے کہ ٹھیک ہے آپ فیصلہ کردیں۔

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک چیز کے دو مدعی ہوں اور دونوں کے پاس کوئی گواہ نہ ہو تو وہ چیز تحالف (یعنی دونوں سے حلف لینے) کے بعد دونوں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کردی جاتی ہے، تو غالبًا تم دونوں نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے قسمیں تو کھائی ہوں گی لیکن انہوں نے یہ سوچ کر کہ بچہ تو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس لئے ایک کو دے دیا، یعنی بڑی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کو بچہ دے دیا، لیکن یہ تو انصاف نہیں، جیسے بڑی کا حق ہے ویسے ہی چھوٹی کا حق ہے، میرے پاس چھری لاؤ میں بچہ دونوں میں تقسیم کرکے دیتا ہوں، بچے کے دو ٹکڑے کرکے آدھا اس کو دے دوں گا اور آدھا اس کو دے دوں گا، انصاف کا فیصلہ ہی یہ ہے، آپ نے خادم کو حکم دیا کہ چھری لاؤ، تو چھوٹی نے ہاتھ جوڑ دیئے کہ بچہ اس کا ہے، میرا نہیں، میں اپنے دعوے سے دستبردار ہوتی ہوں، اور بڑی کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی بلکہ اس کا دل خوش ہوا ہوگا کہ میرا بچہ تو بھیڑیا کھا گیا

اس کا بچہ بھی دوٹکڑے ہوجائے، حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ بچہ ہو اور چھری لائی جائے اور ماں کا دل اپنی جگہ برقرار رہ جائے، یہ ممکن نہیں! یہ بچہ بڑی کا نہیں بلکہ چھوٹی کا ہے، بچہ چھوٹی کو دلوادیا اور چلے گئے۔ اس واقعہ کوقرآن کریم نے ذکر فرمایا: ''فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ.'' (ہم نے سلیمان کوسمجھایا)۔

تو حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام اگرچہ چھوٹے تھے لیکن زیرکی اور دانائی میں اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے، حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ سوچ کر کہ بڑا آدمی تو جھوٹ نہیں بول سکتا، اس لئے بچہ بڑی کو دے دیا، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ بچے کے دوٹکڑے کردیئے جاتے، کیونکہ یہ تو کسی قاعدہ وقانون میں نہیں ہے، ہاں البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صرف آزمائش کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔

لہٰذا اگر کوئی بچہ مل جائے اور دو آدمی اس کے مدعی ہوں اور ہر ایک یہ کہے کہ بچہ میرا ہے تو بچہ ٹکڑے کرکے نہیں دیا جائے گا، بلکہ شرع کا فتویٰ یہ ہے کہ دونوں سے کہہ دیا جائے کہ یہ بچہ تم دونوں کا ہے تم اس بچہ میں آدھے آدھے شریک ہو، اگر وہ بچہ مرے گا تو اس کی آدھی آدھی وراثت تم دونوں کو ملے گی، اور اگر ان دونوں میں سے کوئی مرے گا تو یہ بچہ پورے بیٹے کی وراثت لے گا کیونکہ یہ دونوں کا بیٹا ہے۔

تو غرضیکہ حکمت اور دانائی یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں، عطا فرماتے ہیں۔

شیخ سعدیؒ کے بقول بچپن ہی سے بلندی کا ستارہ چمک رہا تھا اور بعض ایسے ہیں، جیسے میں نے شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کی اصطلاح ذکر کی تھی کہ: ''بوڑھے تو ہوگئے مگر رہے نابالغ کے نابالغ، عقل نہیں آئی۔''

عقل وشعور کا اندازہ:

اس کے بعد فرمایا کہ آدمی کی عقل کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ یہ دیکھو کہ

وہ کن امور میں حصہ لیتا ہے؟ اور اس کے اخلاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس حیثیت کا آدمی ہے؟ لہٰذا گھٹیا امور سے پرہیز کرو اور اسی طرح پتلے قسم کے اخلاق اور گھٹیا اخلاق سے پرہیز کرو، تمہارے اخلاق جس قدر بلند ہوں گے اسی سے تمہاری قدوقامت کا، تمہاری عقل کا، تمہاری فہم کا، تمہارے شعور کا اندازہ ہوگا۔

ایک حدیث میں ہے:

”عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: عُرِضْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ جَیْشٍ وَاَنَا ابْنُ اَرْبَعَ عَشْرَۃَ، فَلَمْ یَقْبَلْنِیْ، فَعُرِضْتُ عَلَیْہِ مِنْ قَابِلٍ فِیْ جَیْشٍ وَاَنَا ابْنُ خَمْسَ عَشْرَۃَ فَقَبِلَنِیْ۔“ (ترمذی ج:۱ ص:۱۶۲)

ترجمہ:......”حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جنگ بدر کے موقع پر چودہ سال کے تھے، فرماتے ہیں کہ میں جہاد کے لئے پیش ہوا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا اور اگلے سال پندرہ سال کی عمر ہوگئی تو قبول فرمالیا۔“

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا تقویٰ:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حد سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بالاتفاق کہا کرتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا رنگ اگر کسی کے اوپر ہے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر ہے، زمانے کی ہوا سے سب کا رنگ پھیکا ہوجاتا ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا رنگ پھیکا نہیں ہوا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھنے والے فرماتے ہیں کہ: اگر تم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھتے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو کیسے تلاش کرتے ہیں تو تم سوچتے کہ یہ پاگل ہے۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اتباعِ سنت:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سفر حج پر تشریف لے جاتے ہوئے ایک جگہ اونٹنی کو بٹھایا اور پیشاب کے لئے بیٹھے، خادم نے کہا کہ حضرت! پیشاب کی ضرورت کا تقاضا ہے؟ فرمایا: نہیں! میں یہاں اس لئے بیٹھا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ بیٹھے تھے، مجھے پیشاب کا تقاضا نہیں تھا، مگر چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بیٹھے تھے، اس لئے میں بھی بیٹھا ہوں، اندازہ کرو کہ اتباع سنت کا شوق کتنا تھا؟ سچ ہے کہ ان حضرات نے اپنے محبوب کی ہر ادا کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

محبت کی علامت:

مجھے تین دن پہلے کسی آدمی نے کہا کہ ایک مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ: گریبان کھلا رکھنا چاہئے اور وہ مولانا صاحب اپنا گریبان کھلا ہی رکھتے ہیں، میں نے کہا کہ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی بات ہے۔

اصل قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اتفاق سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گریبان کھلا ہوا تھا، تو اس صحابیؓ نے ساری عمر بٹن نہیں لگائے اور یہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے محبوب کو اسی طرح دیکھا ہے، اس صحابیؓ نے جس رنگ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ساری عمر اسی رنگ میں رہے اور یہ تو صحابہ کرامؓ کی بات ہے۔

اکابرؒ کی بے نفسی:

میرے استاذ حضرت مولانا عبداللہ رائے پوریؒ کے والد ماجد حضرت مفتی فقیر اللہ رحمہ اللہ تھے (میں نے پہلے بھی ان کا تذکرہ کیا تھا)، وہ جب کسی کو سلام

بھجواتے تو فرماتے کہ: ان کو کہنا کہ کانہ موچی سلام عرض کر رہا ہے۔ حالانکہ پنجاب میں اپنے وقت کے مفتیٔ اعظم تھے۔

اکابرؒ کی تقلید:

حضرت مولانا عبداللہ رائے پوریؒ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد قمیص میں بٹن کی جگہ گھنڈی لگاتے تھے، ہم نے درخواست کی کہ حضرت اب تو بہت اچھے اچھے بٹن آگئے ہیں، آپ بٹن لگالیں، اس گھنڈی کا بنانا بھی زحمت اور پھر لگانا بھی زحمت ہے، تو حضرت ارشاد فرماتے کہ: میں نے اپنے شیخ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کو اسی طرح دیکھا ہے، تو ساری عمر اسی طرح رہے، بٹن نہیں لگائے۔

آپ ﷺ کا حسن و جمال:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حسین وجمیل ومحبوب چشم و فلک نے نہیں دیکھا، کہاں کی لیلیٰ؟ کہاں کی زینب؟ اور کہاں کی حسینہ؟ (یہ عربوں کی محبوباؤں کے نام ہیں، جن کی وہ اشعار میں تشبیہ دیا کرتے تھے)، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر چشم فلک نے کسی عاشق زار کو نہیں دیکھا ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کا عشق نبوی ﷺ:

میں نے صلح حدیبیہ کا ذکر کیا تھا کہ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ آئے تھے جو اس وقت تک کافر تھے، کافروں کے نمائندہ بن کر آئے تھے (بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور ان کی قوم نے ان کو شہید کردیا تھا)، ایسی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ محمد! تمہارے اردگرد یہ بھانت بھانت کی لکڑیاں ہیں، کہیں کی اینٹ ہے اور کہیں کا روڑہ ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جب مقابلہ ہوگا تو یہ تتر بتر ہوجائیں گے، بھاگ جائیں گے، وہ دراصل یوں ہی ایسے آزمانے کے لئے، چھیڑنے کے لئے کہہ رہے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ موجود تھے اور ان کی یہ باتیں سن رہے

تھے، سیدھی گالی نکالی (اس کا کھلا ترجمہ میں کیسے کروں؟) فرمایا: تو جا اپنے ''لات'' (''لات'' عورت کی شکل میں مورتی تھی) کی اندام نہانی کو چوس! کیا ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟ حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کہنے لگے یہ کون صاحب ہیں؟ کہا گیا کہ حضرت ابوبکرؓ ہیں، حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا سر جھک گیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے کہ حضور! جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں، مگر آپ کا جاہلیت کے زمانے کا ایک احسان میرے سر پر ہے، آج تک اس کا بدلہ نہیں دے سکا ہوں، اس لئے خاموش ہوں، ورنہ اس وقت کا تقاضا ہے کہ آپ کی سخت کلامی کا جواب دوں۔

حضرت عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ عربوں کے دستور کے مطابق بات کرتے ہوئے بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگا رہے تھے، ریش مبارک کو ہاتھ لگا رہے تھے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر ننگی تلوار لئے کھڑے پہرہ دے رہے تھے، تو جب بھی حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتے (حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ) ان کے ہاتھ پر بٹ مارتے اور فرماتے: اپنے ناپاک ہاتھوں کو پیچھے کر، حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ صحابہؓ نے کہا یہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ ہیں، حضرت عروہؓ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ اے غدار! ابھی تو میں تیری دیت کا تاوان دے کے آیا ہوں۔ جاہلیت کے زمانے میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے کوئی قتل کر دیا تھا، اس کی دیت حضرت عروہ بن مسعودؓ نے ادا کی تھی۔

حضرت عروہ بن مسعودؓ کا اعتراف:

حضرت عروہ بن مسعودؓ بڑے آدمی تھے، جب وہ واپس اپنی قوم کے پاس

گئے (لمبا قصہ ہے، اس کا یہ فقرہ یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں) انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو! تم جانتے ہو کہ میں قیصر کے دربار میں گیا ہوں، کسریٰ کے دربار میں گیا ہوں، شاہِ حبشہ کے دربار میں گیا ہوں، بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں گیا ہوں، کوئی بادشاہ ایسا نہیں جس کے دربار میں میں نے حاضری نہ دی ہو، اللہ کی قسم! میں نے کوئی ایسا دربار نہیں دیکھا جس میں لوگ اپنے بڑے کی ایسی تعظیم کرتے ہوں اور ایسی محبت کرتے ہوں جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کرتے ہیں (وہ کیا دیکھتا میں تو کہتا ہوں کہ چشم فلک نے نہیں دیکھا)۔

پھر کہا کہ واللہ! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی تھوکتے ہیں تو ان میں سے کوئی نہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اپنے ہاتھ پر لے لیتا ہے اور فوراً اپنے چہرہ پر مل لیتا ہے۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب وضو فرماتے ہیں تو ان کے اعضائے شریفہ سے جو پانی ٹپکتا ہے ان کے اصحاب اس پر لڑتے ہیں، اس کو زمین پر نہیں گرنے دیتے، تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

حضرت ثوبانؓ کا عشق:

تو غرضیکہ صحابہ کرامؓ کی یہ ہی شان تھی، وہ اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق، اپنے اپنے ظرف کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مرمٹ گئے تھے، لیکن صحابہ میں بھی تو بڑے اور چھوٹے ہیں، صحابہ کرامؓ کی جاں نثاری عجیب وغریب ہوتی تھی۔

ایک روایت میں ہے:

"(اِنَّهَا نَزَلَتْ فِیْ ثَوْبَانَ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) وَکَانَ شَدِیْدُ الْحُبِّ لَهٗ، قَلِیْلُ الصَّبْرِ عَنْهُ، فَاَتَاهُ ذَاتَ یَوْمٍ وَقَدْ تَغَیَّرَ لَوْنُهٗ وَنَحِلَ جِسْمُهٗ یُعْرَفُ فِیْ

وَجُهِهِ الْحُزْنُ، فَقَالَ لَهٗ: ”يَا ثَوْبَانُ! مَا غَيَّرَ لَوْنُكَ؟“ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا بِيْ ضَرٌّ وَلَا وَجْعٌ غَيْرَ اَنِّيْ اِذَا لَمْ اَرَكَ اِشْتَقْتُّ اِلَيْكَ وَاسْتَوْحَشْتُ وَحْشَةً شَدِيْدَةً حَتّٰى اَلْقَاكَ ثُمَّ ذَكَرْتُ الْآخِرَةَ وَاَخَافُ اِلَّا اَرَاكَ هُنَاكَ لِاَنِّيْ عَرَفْتُ اَنَّكَ تَرْفَعُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَاِنِّيْ اِنْ اُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ كُنْتُ فِيْ مَنْزِلَةٍ هِيَ اَدْنٰى مِنْ مَّنْزِلَتِكَ وَاِنْ لَّمْ اُدْخَلْ فَذَالِكَ حِيْنَ لَا اَرَاكَ اَبَدًا۔ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْآيَةَ۔“ (قرطبی ج:۵ ص:۲۷۱)

ترجمہ:......”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد کردہ غلام حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو چہرے کا رنگ زرد تھا، جیسے بہت نقاہت ہوتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہوئی؟ چہرے کا رنگ اڑا ہوا ہے، کہنے لگے: یا رسول اللہ! نہ کوئی نقصان ہوا ہے اور نہ ہی کوئی تکلیف ہے، ایک غم نے ہلکان کیا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ خیر کرے! کیا غم ہے؟ کیا فکر ہے؟ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آدھی رات کو دل کرتا ہے کہ اٹھ کر آپؐ کی زیارت کروں تو حاضر ہوجاتا ہوں اور جب چہرۂ انور پر نظر ڈالتا ہوں تو دل ٹھنڈا ہوجاتا ہے، پھر جاکر سو جاتا ہوں، اور جب کبھی آپؐ کا تصور آجاتا ہے، خیال آجاتا ہے تو چین نہیں آتا جب تک حضورؐ کی زیارت نہیں کرلیتا، پھر آخرت کا سوچتا ہوں تو خوف آتا ہے کہ آخرت میں تو آپ کی زیارت نہیں کرسکوں گا، کیونکہ میں جانتا

ہوں کہ آپ کا مرتبہ تو بہت بلند ہوگا اور میں اگر جنت میں داخل ہو بھی گیا تو میرا مرتبہ آپؐ سے بہت ہی کم ہوگا اور اگر جنت میں داخلہ نہ ملا تو اس صورت میں تو میں آپ ﷺ کو کبھی بھی نہیں دیکھ سکوں گا، تو ان کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ:

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی تو یہ لوگ ہوں گے ان کے ساتھ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کر رکھا ہے۔''

انعام یافتہ:

سورۂ فاتحہ جس میں ہم یہ آیت پڑھتے ہیں:

''اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ۔ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ۔ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ۔''

ترجمہ:......''یا اللہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت نصیب فرما، وہ صراط مستقیم جو راستہ ہے ان لوگوں کا، (ان اکابر کا، ان بزرگوں کا، ان اللہ تعالیٰ کے بندوں کا) جن پر آپ نے انعام فرمایا، پھر نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔''

یعنی مرتے دم تک یہ حضرات اللہ کے انعام میں رہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بجا لائے، یہ اطاعت کرنے والے ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔

اور یہ انعام یافتہ لوگ کون ہیں؟ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے:

''اُوْلٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡھِمۡ مِنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ

رَفِیْقًا۔“ (النسآ:۶۹)

ترجمہ:......”اور وہ لوگ جن پر اللہ نے انعام کیا وہ یہ ہیں: نبی، صدیق، شہدأ اور اعلیٰ درجہ کے نیک لوگ (جن کو اولیأ اللہ کہتے ہیں) اور (آخر میں فرماتے ہیں) یہ حضرات بہت ہی خوب ہیں رفیق ہونے کے اعتبار سے۔“

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم کا ظرف:

بہت پرانی بات ہے کہ ایک صاحب نے حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے بارے میں چند اعتراضات لکھ کر بھیجے تھے، میں نے اس کا جواب لکھا اور وہ جواب میری کتاب ”آپ کے مسائل اور ان کا حل“ میں چھپا ہوا ہے، اس میں میں نے ایک فقرہ لکھا ہے وہ یہ کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کا سانحہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آنکھوں کے سامنے گزرا، یہ تو ان کا حوصلہ تھا کہ وہ اس کو برداشت کر گئے، کیونکہ جن کا ایسا محبوب روپوش ہوگیا ہو اور وہ پھر بھی زندہ رہیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا ظرف عطا فرمایا تھا کہ وہ اس صدمہ کو برداشت کر گئے، اور آج ہمیں ان کے واقعات پر تعجب ہوتا ہے، بہرحال حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار صحابی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، اور صحابہ کرامؓ میں اتباع سنت میں نہایت ممتاز تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا ایک ایک جزئیہ تلاش کرتے تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور اکابر کا ادب:

صحیح بخاری میں ہے:

”عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ رَسُوْلَ

اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجَرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَهِيَ مَثَلُ الْمُسْلِمِ، حَدِّثُوْنِيْ مَا هِيَ؟ فَوَقَعَ النَّاسُ فِيْ شَجَرِ الْبَادِيَةِ، وَوَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ اَنَّهَا النَّخْلَةُ۔ قَالَ عَبْدُاللهِ: فَاسْتَحْيَيْتُ۔ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللهِ! اَخْبِرْنَا بِهَا۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هِيَ النَّخْلَةُ! قَالَ عَبْدُاللهِ: فَحَدَّثْتُ اَبِيْ بِمَا وَقَعَ فِيْ نَفْسِيْ۔ فَقَالَ: لَاَنْ تَكُوْنَ قُلْتَهَا اَحَبُّ لِيَّ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ لِيْ كَذَا وَكَذَا۔"

(بخاری ج:۱ ص:۲۴)

ترجمہ:...... "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: بتاؤ وہ درخت کون سا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے، جس کی مثال مسلمان کی مثال ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں یہ سن کر صحابہ کرامؓ جنگلوں میں دوڑتے پھرے، یعنی ذہن میں سوچنے لگے کہ کون سا درخت ہوسکتا ہے؟ میرے جی میں آئی یہ کھجور کے بارے میں فرما رہے ہیں، (لیکن میرے اکابر پہلی صف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، میرے والد ماجد حضرت عمرؓ اور ان سے بھی بڑے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ عشرہ مبشرہ وہاں موجود تھے، اس لئے میں نے کہنے کی جرأت نہیں کی)، صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہی بتلادیجئے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: یہ کھجور کا درخت ہے۔ گھر آکے میں نے اباجی سے کہا کہ: میرے جی میں آئی تھی کہ میں بتادوں کہ یہ

کھجور کا درخت ہے، لیکن میں ادب کی وجہ سے چپ کرگیا (یہ اکابر بیٹھے ہیں ان کی موجودگی میں جرأت کروں)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹا! اگر تم بتادیتے تو میرے لئے لائق فخر ہوتا۔“

بہرحال انہیں بیٹے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خط لکھا (خط کی بات بعد میں کریں گے) ان کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احتیاط:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ سفر پر گئے تو مصر کے گورنر نے بیت المال کی کوئی چیز ان کو دے دی اور کہا کہ: یہ تمہیں قرض کے طور پر دیتا ہوں، تم مدینہ میں جاکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دینا، قرض کے طور پر اس لئے دیتا ہوں کہ اگر یہ ضائع ہوگئی تو تمہارے ذمہ پڑے گی اور اگر امانت کے طور پر دوں گا تو ضائع ہونے کی صورت میں تم پر ضمان نہیں آئے گی، کیونکہ امانت کا ضمان نہیں ہوسکتا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ٹھیک ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس مال سے اپنی تجارت کا سامان خرید لیا اور اس کو فروخت کیا، رقم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے اس مال سے تجارت کی ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ جی ہاں! حضرت عمرؓ نے کہا: کچھ نفع بھی ہوا؟ کہا کہ: جی! فرمایا: کہ وہ نفع بھی لادو، یہ بات صحیح تھی کہ گورنر نے یہ مال تمہیں قرض کے طور پر دیا تھا اور اس سے یہ مراد تھی کہ ضمان تم پر آئے، لیکن میں جانتا ہوں کہ انہوں نے یہ مال تمہیں ایک خلیفہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے دیا اور وہ گورنر بیت المال سے اتنا بڑا قرض کسی عامی آدمی کو نہ دیتا، یہ خلیفہ کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دیا ہے، میں اس کو تمہارے لئے جائز نہیں سمجھتا، اس منافع کو بھی بیت المال میں جمع

کرواؤ، اگر یہ مال ضائع ہوجاتا تو ضمان بھی غریبوں پر آتا اور جو نفع ہوا وہ بھی عوام الناس کے لئے وصول ہوا۔

خوفِ الٰہی کی برکت:

تو ان کو (یعنی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو) یہ تحریر فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں، تم ہر وقت اللہ کا خوف اور ڈر اپنے سامنے رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بچالیتا ہے، اور جو شخص اللہ پر توکل کرے اور بھروسہ کرے، محض اللہ کے بھروسے پر کام کرتا رہے اور مخلوق پر نظر نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس کی کفایت فرماتے ہیں، وہ اکیلا کافی ہے۔

اللہ کا کام اللہ کے لئے:

اس لئے میں ہمیشہ مولویوں سے کہتا ہوں کہ اللہ کا کام کرو، اللہ کے لئے کرو، اور اللہ کے بھروسہ پر کرو۔ اللہ کا کام کرو، دوسرے کام مت کرو۔ اللہ کے لئے کرو، اپنے کسی مقصد کے لئے، کسی غرض کے لئے نہ کرو، محض اللہ کا کام سمجھ کر کرو اور اللہ کے بھروسہ پر کرو، مخلوق کے بھروسے پر مت کرو، یہ سوچ کر کہ فلاں سیٹھ اگر متوجہ ہوگئے تو اتنا چندہ دے دیں گے، فلاں سیٹھ سے اتنے پیسے مل جائیں گے، ہمارا مدرسہ چل پڑے گا، یہ سوچ نہیں ہونی چاہئے۔

حضرت نانوتویؒ کے اصول:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند نے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں ایک وصیت نامہ اپنے قلم سے اور اپنے الفاظ سے چند دفعات کی شکل میں لکھا تھا، وہ وصیت نامہ آج تک دارالعلوم دیوبند میں محفوظ ہے اور اس کا فوٹو شائع ہوچکا ہے، اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ: یہ دارالعلوم دیوبند اس وقت تک چلے

گا جب تک اس میں بے سروسامانی کا عالم ہوگا، اور کسی حاکم یا کسی مالدار کے مال پر نظر نہیں ہوگی، اور خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو (حضرت کے الفاظ ہیں) پھر یہ کارخانہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

انگریز کا منصوبہ اور اکابرؒ کی حکمت:

ہمارے اکابرؒ نے امت کی بھلائی کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی امانت کی حفاظت کے لئے، علوم دینیہ کی حفاظت کے لئے مدارس کا جال بچھایا، انگریز اس ملک کو اسپین بنانا چاہتا تھا کہ یہاں اسلام کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے، اس نے تمام مدارس جو اس وقت تھے، ضبط کرلئے، بادشاہوں کی طرف سے اوقاف تھے وہ ضبط کرلئے، اور مسجد کے مولوی کو سب سے ذلیل ترین مخلوق قرار دے دیا۔ جتنے علمأ مارے جاسکتے تھے، ماردیئے اور جو باقی رہے ان کا نام کمینوں میں درج کرادیا۔

عموماً گاؤں میں جو چوہدری صاحب کے کام کرنے والے ہوتے ہیں، ان کو کمین کہتے ہیں، کوئی لوہار ہے، کوئی بڑھئی ہے اور کوئی کچھ ہے، انہیں میں مولوی کو بھی شامل کیا۔

دین کے بقأ کی شکل:

ہمارے اکابرؒ کو اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا کہ اب دین کی بقا کی شکل یہ ہے کہ اپنے ذاتی اور نجی مدرسے بناؤ، جس میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو، اللہ کے ان بندوں پر قوم بھی اعتماد کرتی تھی اور آج تک الحمدللہ! کرتی ہے، لوگ بعض مرتبہ چندہ دیتے ہیں، ہمیں کہتے ہیں کہ اس کی رسید کی ضرورت نہیں، میں کہتا ہوں کہ مجھے رسید کی ضرورت ہے، تمہیں ضرورت نہیں مجھے تو ضرورت ہے، میں نے حساب رکھنا ہے، یہ تمہیں جو رسیدیں دیتے ہیں، تمہارے اطمینان کے لئے نہیں دیتے، بلکہ ہم اپنے اطمینان اور اپنے حساب کے لئے دیتے ہیں۔ مدرسے کی رسید ہے، ختم نبوت کی رسید

ہے یا کسی اور چیز کی رسید ہے، ہاں اگر کسی ادارے کی رسید نہ ہو تو ہم پھر رسید نہیں دیتے، ہم اپنی صوابدید کے مطابق جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اس کو خرچ کر دیتے ہیں۔

میرا طرزِ عمل:

میرے یہاں مستقل لفافوں میں مدیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں، میری دراز میں کبھی پیسے زیادہ ہوتے ہیں، کبھی پانچ دس روپے ہوتے ہیں، اور ہر ایک لفافے پر مد لکھی ہوئی ہوتی ہے، یہ صدقے کی ہے، یہ زکوٰۃ کی ہے، یہ فلاں مد کی ہے اور بعض مرتبہ جب میں دراز میں پیسے ڈالتا ہوں تو پھر رات کو اٹھ کر پریشان ہو جاتا ہوں، اسی وقت وہاں پیسے رکھ کر اس کے اوپر لکھ دیتا ہوں کہ خدانخواستہ اگر میں مر گیا تو پھر کیا ہو گا؟

پوری دنیا میں ایسا رنگ نہیں:

تو ان اللہ کے بندوں نے نجی مدرسے بنائے اور قوم نے ان پر اعتماد کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس دین کو اس ملک میں باقی رکھا، بلکہ آپ کے ہندوستان اور پاکستان میں جیسا دین ہے پوری دنیا میں ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ باقی جگہ رنگ بہت بگڑ گیا ہے۔

ازہر یونیورسٹی اور دین داری:

جامع ازہر جو دنیا کا سب سے قدیم اور مشہور مدرسہ ہے، ایک ہزار سال سے زیادہ ہو گیا ہے، وہاں کا حال یہ ہے کہ شیخ الحدیث صاحب سوٹ پہن کر، ٹائی لگا کر، منہ میں سگریٹ لے کر بخاری شریف پڑھا رہا ہے، ایسا کبھی یہاں پاکستان میں دیکھا ہے؟ ٹھیک ہے، یہاں پر لوگ داڑھی منڈواتے ہیں، لیکن کوئی مولوی داڑھی منڈوا کر نماز تو پڑھا کر دکھائے؟ داڑھی منڈے بھی اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو تیار

نہیں ہوتے، کیونکہ یہ امامت کا اہل نہیں ہے، اس کی داڑھی کٹی ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں کا اثر ہے، میں مانتا ہوں کہ عملی کوتاہیاں ہوں گی، عوام الناس میں بھی ہیں، مولویوں میں بھی ہیں، مگر دین داری کا یہ رنگ عوام میں ہو یا خواص میں، کیا آپ کو دنیا میں کسی جگہ ایسا رنگ ملے گا؟ تو اس لئے اللہ کا کام کرو اور اللہ کے لئے کرو اور اللہ کے اعتماد پر کرو۔

ہمارے اکابرؒ نے دین کا کام اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر کیا، مخلوق کے اعتماد پر نہیں کیا، بھروسہ اللہ پر ہے، اس لئے تم بھی اللہ کے بھروسے سے اس کام کو کرو۔

قرضِ حسنہ کا بدلہ:

اور فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کو قرض دے گا اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ عطا فرمائیں گے، یہ تو قرآن کریم کا مضمون ہے:

”مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا۔“

(البقرہ:۲۴۵)

ترجمہ:......”کون ہے جو اللہ کو قرض دے قرضِ حسن۔“

قرضِ حسن کا معنی یہ ہے کہ جس بندے کو قرض دے رہا ہے، قرض دینے والا اس پر احسان نہ جتائے، بلکہ قرض دینے والا اس لینے والے کا احسان مانے، اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا کرکے دیں گے۔

بااخلاص صدقہ کی عظمت:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”فَاِنَّ اللّٰہَ یَتَقَبَّلُھَا بِیَمِیْنِہٖ ثُمَّ یُرَبِّیْھَا لِصَاحِبِھَا کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فَلُوَّہٗ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلُ الْجَبَلِ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۶۷)

ترجمہ:......’’(جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ کرتا ہے تو) ’’رحمٰن‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کو ایسا پالتے ہیں جیسے کوئی آدمی گھوڑے کے بچے کو پالتا ہے، اور جب وہ آدمی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اس صدقہ کا ثواب جو اللہ کی رضا کے لئے کیا تھا احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔‘‘

جتنا کوئی اخلاص کے ساتھ صدقہ دے گا اتنا اس کی پرورش ہوگی۔

قرآن کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

’’مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ وَاللہُ یُضَاعِفُ لِمَنْ یَشَآءُ۔‘‘ (البقرہ:۲۶۱)

ترجمہ:......’’مثال ان لوگوں کی جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں مثال اس دانے کی ہے جس نے سات خوشے اُگائے اور ہر خوشے میں سو دانے تو ایک دانے کے سات سو بن گئے اور اللہ پاک اضافہ فرماتے رہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں۔‘‘

ایک کے سات سو:

کم سے کم اللہ تعالیٰ دس گنا دیتے ہیں، اور زیادہ تعداد سات سو کی ہے، لیکن یہاں زیادہ تعداد قانون کے مطابق ہے، ورنہ کسی کو سات ہزار دیتے ہیں، کسی کو سات لاکھ دیتے ہیں اور کسی کو ستر لاکھ دیتے ہیں اور کسی کو بغیر حساب کے دیتے ہیں، تو جو شخص خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے دے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اس کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

شکرِ نعمت:

جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کھا کر شکر ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ عطا فرماتے ہیں۔

یہ بھی قرآن کریم کا مضمون ہے: ”لَئِنۡ شَکَرۡتُمۡ لَاَزِیۡدَنَّکُمۡ۔“ (ابراہیم:۷) یعنی اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں زیادہ دیں گے۔ جتنا شکر زیادہ کرو گے اتنی نعمت زیادہ ملے گی۔

تقویٰ نصب العین:

فرمایا کہ دیکھو تقویٰ کو نصب العین بناؤ۔

نصب العین کہتے ہیں وہ چیز جو ہمیشہ پیش نظر رہے، اور اپنے عمل کا اعتبار بناؤ اور اپنے دل کی روشنی بناؤ، تمہارے دل میں روشنی اسی تقوے سے ہونی چاہئے، اس لئے کہ نیت کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کے ثواب کی توقع نہ ہو تو اجر نہیں ملتا۔

مال نہ ہونے کے برابر:

جو شخص کہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرے، اس کا مال نہ ہونے کے برابر ہے، اس کے لئے مال ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

پرانا نہیں تو نیا نہیں:

اور آخری فقرہ ہے کہ اس شخص کے لئے نیا نہیں ملتا جس کے لئے پرانا نہ ہوگا۔

میں نے اس کو یوں پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا پرانا عمل ہوگا تو نئے

عمل کی توفیق ہوگی، اگر پہلے ہی سے عمل نہیں تو اس پر نیا نتیجہ کیا مرتب ہوگا؟ اور یہ بات بھی ہے کہ نیا کپڑا پہنو تو پرانے کو صدقہ کردو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب نیا کپڑا تیار ہوتا تھا اور زیب تن فرماتے تھے تو پرانے کو صدقہ کردیتے تھے، حق تعالیٰ شانہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ کی پانچ نصیحتیں!

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول ہوا کرے، وہ ناپاک لقمہ سے پرہیز کرے، ناپاک کیا چیز ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ بعض چیزوں کو اللہ نے ناپاک فرمایا ہے اور بعض کو پاک فرمایا ہے۔ بکری پاک ہے، اس کا گوشت پاک ہے، اور خنزیر ناپاک ہے، خرگوش پاک ہے اور بلی ناپاک ہے، حلال وحرام کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ جُبَیْرِ بْنِ نُضَیْرٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِاَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: عَلِّمْنِیْ کَلِمَۃً یَنْفَعُنِیَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ بِھَا۔ قَالَ: وَثِنْتَیْنِ وَثَلَاثًا وَاَرْبَعًا وَخَمْسًا، مَنْ عَمِلَ بِھِنَّ کَانَ ثَوَابُہُ عَلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ اَلدَّرَجَاتُ الْعُلٰی۔ قَالَ: لَا تَأْکُلْ اِلَّا طَیِّبًا، وَلَا تَکْسِبْ اِلَّا طَیِّبًا، وَلَا تُدْخِلْ بَیْتَکَ اِلَّا طَیِّبًا، وَسَلِ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَرْزُقُکَ یَوْمًا بِیَوْمٍ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَاعْدُدْ نَفْسَکَ مِنَ الْاَمْوَاتِ فَکَاَنَّکَ قَدْ لَحِقْتَ بِھِمْ، وَھَبْ عِرْضَکَ لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، فَمَنْ سَبَّکَ اَوْ شَتَمَکَ اَوْ قَاتَلَکَ فَدَعْہُ لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ، وَاِذَا أَسَأْتَ فَاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ۔“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۲۲)

ترجمہ:...... ”امام ابونعیم نے حلیہ میں عبدالرحمٰن بن جبیر بن نضیر سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابودرداءؓ رضی

اللہ عنہ سے عرض کیا کہ: مجھے ایک کلمہ سکھلا دیئے (ایک بات سکھلا دیجئے) جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مجھے نفع عطا فرمائیں۔ فرمایا کہ: (ایک نہیں)، دو، تین، چار، پانچ یعنی پانچ باتیں بتلاتا ہوں، جو شخص ان پر عمل کرے گا، اس کا ثواب اللہ پاک کے پاس بلند درجات پر ہوگا۔ فرمایا کہ: صرف پاکیزہ چیز کھاؤ، پاکیزہ کمائی کرو، اور گھر میں جب داخل ہو تو پاکیزگی کی حالت میں داخل ہو، اللہ تعالیٰ سے دن کے دن کا رزق مانگا کرو، اور جب تو صبح کرے تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر، گویا کہ تو ان کے ساتھ جا ملا ہے، اور اپنی عزت اللہ تعالیٰ کو ہبہ کردو، جو شخص تم کو گالی دے، برا بھلا کہے یا تم سے لڑائی کرے، اس کو اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ دو، اور جب کوئی برائی ہو جائے تو فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔"

یعنی حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے کہا کہ: مجھے نصیحت کی کوئی ایک بات فرما دیجئے، تاکہ میں اس پر عمل کروں، اللہ پاک مجھے اس کے ذریعہ سے نفع عطا فرمائے۔ حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: ایک نہیں، دو، تین، چار، پانچ یعنی پانچ باتیں بتلاتا ہوں، جو شخص ان پر عمل کرے گا، اللہ کے ہاں اس کے بلند درجات ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اس کو بلند درجات کا ثواب عطا فرمائے گا۔

پہلی بات یہ کہ تین چیزوں کی پابندی کرو، ایک یہ کہ پاک کھاؤ گے، پاک کماؤ گے اور پاک ہونے کی حالت میں گھر آؤ گے۔ ناپاک چیز تمہارے پیٹ میں نہ جائے، ناپاک چیز تمہاری کمائی میں شامل نہ ہو، اور ناپاک ہونے کی حالت میں اپنے گھر میں نہ آؤ۔

حلال پاک کھانے کا اہتمام:

پاک اور طیب کھانے کا اہتمام! یہ اللہ کے محبوب بندوں کی علامت ہے، ہم تو جانور ہیں، جو کچھ بھی مل جائے اس پر منہ مارتے ہیں، جانور کا یہی کام ہوتا ہے، اس کو اس سے غرض نہیں کہ یہ میرے مالک کا ہے یا نہیں؟ یا میرے حصے کا ہے یا نہیں؟ اس کا منہ جہاں تک پہنچ جائے، وہ اس کو ہڑپ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا کھانے پینے کے معاملہ میں جانور نہ بنو، بلکہ پاک کھاؤ۔

ایک حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

''اِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اُمِرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ، فَقَالَ: يَا اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔''

(مشکوٰۃ ص:۲۴۱)

ترجمہ:...... ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو جو حکم دیا ہے، وہی حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان دار بندوں کو بھی دیا ہے، رسولوں سے فرمایا کہ: اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔''

اور اہل ایمان سے فرمایا:

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ۔'' (البقرۃ:۱۷۲)

ترجمہ:...... ''اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دیں۔''

دوسری جگہ اللہ پاک نے فرمایا:

''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔'' (البقرۃ:۲۶۷)

ترجمہ:......''اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم کماؤ اور جو پاکیزہ چیزیں ہم نے زمین سے نکالی ہیں۔''

مؤمن کو پاک کھانے کا اہتمام کرنا چاہیۓ، ناپاک کھانے کا لقمہ اس کے پیٹ میں نہ اترے۔

پاک و ناپاک:

اکابرؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول ہوا کرے، وہ ناپاک لقمہ سے پرہیز کرے، ناپاک کیا چیز ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ بعض چیزوں کو اللہ نے ناپاک فرمایا ہے اور بعض کو پاک فرمایا ہے۔ بکری پاک ہے، اس کا گوشت پاک ہے، اور خنزیر ناپاک ہے، خرگوش پاک ہے اور بلی ناپاک ہے، حلال و حرام کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہے کہ یہ چیز اچھی ہے یا یہ چیز گندی ہے، شراب کو ناپاک فرمایا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ۔'' (المائدہ:۹۰) یعنی یہ گندی چیز ہے، شیطان کے عمل سے ہے، اس سے بچا کرو۔ تو شراب کو حرام فرمایا ہے، اسی طرح جو چیزیں شریعت نے حلال کی ہیں وہ پاک ہیں اور جو چیزیں حرام کی ہیں وہ ناپاک ہیں، پاک کھاؤ، ناپاک نہ کھاؤ۔

دوسری بات یہ کہ حدیث شریف میں ہے:

''لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ۔''

(کنزالعمال ج:۱ حدیث:۳۹۷)

ترجمہ:......''کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہوتا مگر اس کے دل کی خوشی سے۔''

طیب نفس اور دل کی خوشی سے اگر کوئی تمہیں اپنی چیز کھلاتا ہے تو تمہارے

لئے کھانا جائز ہے اور زبردستی کھاتے ہو تو ناجائز ہے، حرام ہے، کسی کی بکری چوری کرلی اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اس کو ذبح کردیا، وہ حلال نہیں ہے، وہ اسی طرح حرام ہے جس طرح مردار حرام ہے، چوری کی بکری کو تکبیر پاک نہیں کرتی وہ ناپاک ہی رہتی ہے۔ اسی طرح تم نے کسی کی چیز غصب کرلی، دبادی، وہ چیز تمہارے لئے حلال نہیں ہے، کسی کے مکان پر زبردستی قابض ہوگئے اور اس کو استعمال کرتے ہیں، ایک نماز جو اس صورت میں پڑھو گے وہ چالیس دن قبول نہ ہوگی۔ چوری کی بجلی استعمال کرتے ہیں، اس کا استعمال حرام ہے، اور اس بجلی میں جو تم عبادتیں کرتے ہو وہ بھی قبول نہ ہوں گی۔

تو غرضیکہ پرایہ مال کھانا اس کی رضامندی کے بغیر یہ حلال نہیں، حرام ہے۔ پاک نہیں، ناپاک ہے۔ ناپاک نہ کھاؤ!

ناپاک کمائی کیا ہے؟

دوسرا یہ کہ کماؤ بھی پاک، تمہارے گھر میں ناپاک کمائی نہیں آنی چاہئے، ناپاک کمائی کیا ہے؟ کمانے کے جو طریقے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائے ہیں، وہ پاک ہیں، اور جو طریقے ممنوع و ناجائز ٹھہرائے ہیں وہ ناپاک ہیں۔ اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم ہوسکتی ہے۔ کمائی کے جو طریقے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ممنوع وحرام ہیں، اگر وہ آپس کی رضامندی سے ہوں تب بھی حرام وممنوع ہیں اور ناپاک ہیں، سود کا لین دین اللہ نے حرام فرمایا ہے اور اس کے خلاف اعلان جنگ فرمایا ہے، قرآن کریم میں ہے:

”فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔“
(البقرۃ:۲۷۹)

ترجمہ:......”اگر تم اس کو نہیں چھوڑتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہوجاؤ!“

اسی طرح رشوت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لَعَنَ اللّٰہُ الرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِی وَالرَّائِشَ بَیْنَھُمَا۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۲۶، مسند احمد ج:۲ ص:۳۸۷)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے رشوت لینے اور دینے والے پر، اور ان دونوں کے درمیان دلالی کرنے والے پر۔“

مشکوٰۃ میں صحیح مسلم کے حوالے سے حدیث ہے:

”لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آکِلَ الرِّبٰوا وَمُؤْکِلَہٗ وَکَاتِبَہٗ وَشَاھِدَیْہِ، وَقَالَ: ھُمْ سَوَاءٌ۔“

(مشکوٰۃ ص:۲۴۵)

ترجمہ:......”اللہ نے لعنت فرمائی ہے سود لینے والے پر اور سود دینے والے پر اور اس کو لکھنے والے پر اور اس کی گواہی دینے والوں پر اور فرمایا کہ: یہ گناہ میں سب برابر ہیں۔“

سودخور پر لعنت کا مطلب!

علمائ فرماتے ہیں کہ ”لعن اللہ“ کا لفظ کے دو معنی ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ صیغہ دعا کا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا فرماتے ہیں کہ اللہ لعنت فرمائے ان لوگوں پر۔

اسی طرح خرید وفروخت کی جو چیزیں شریعت نے حرام کی ہیں، ان کا لین دین کرنا اور ان کے ذریعہ سے پیسہ کمانا حرام ہے۔

بیع وشراء کے احکام سیکھنے کی ضرورت ہے:

حضرت جی مولانا محمد یوسفؒ رائے ونڈ میں تقریر فرمارہے تھے اور وہ اپنے بیان میں فرمارہے تھے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے کچھ کمالیں پھر تبلیغ میں نکلیں گے، حضرتؒ نے فرمایا کہ جب سیکھے بغیر کماؤ گے تو حرام کماؤ گے، تمہیں جائز وناجائز کا تو پتہ نہیں اور حلال وحرام کی پرواہ نہیں اور حلال کے اثرات وحرام کے اثرات کی تمیز نہیں، دل میں آخرت کا خوف اور خدا کا خوف نہیں، تو تمہیں کس نے کمانے کو کہا کہ پہلے کماؤ پھر تبلیغ کو چلیں گے۔

اسی بیان میں یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بازار میں دکان کھولنے کی اجازت صرف اس شخص کو ملتی تھی جو لین دین، خرید وفروخت کے مسائل جانتا ہو، پہلے اس کا امتحان لیتے تھے کہ جانتا بھی ہے؟ اب تو حکومت کو کوئی ٹیکس دے دے اور پولیس کو بھتہ دے دے تو پھر ٹھیک ہے، کہتے ہیں کہ صاحب کرو جو کچھ کرنا ہے، خود بھی حرام کھائے اور پولیس وحکومت کو بھی حرام کھلائے۔

کل ایک صاحب کا خط ملا، اس میں لکھا تھا کہ کچھ دوست کھیل کھیلتے ہیں، اور اس کھیل میں کوئی ہار جائے تو اس سے بوتلیں یا چائے پیتے ہیں۔ میں نے کہا: جرمانہ کرنا حرام ہے، ہمارے فقہاءؒ حنفیہ نے لکھا ہے کہ جرمانہ کی سزا دینا حرام ہے۔ کسی پر ڈنڈ وتاوان لگادیتے ہیں، حکومت جرمانہ کردیتی ہے، یہ حرام ہے، اس رقم کا لین دین بھی حرام ہے، یہ میں نے چند مسائل کی طرف اشارہ کردیا ہے، کہنا یہ ہے کہ حلال کھانے کا اہتمام اور حلال کمانے کا اہتمام کرو۔

حرام غذا کے اثرات:

تمہارے اور تمہارے بیوی بچوں کے پیٹ میں ناپاک چیز نہ جائے۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ:

آں خورد گردد (پلیدی) از و جدا
وآنکہ خورد گردد ہما نور خدا

ایک یہ کھانا کھاتا ہے تو اس سے گندگی نکلتی ہے، اور وہ کھاتا ہے سب کا سب نورِ خدا بن جاتا ہے۔ کھانے کی ایک گندگی حسّی نکلتی ہے، جیسے بول و براز کہتے ہیں، اور ایک گندگی اخلاقِ خبیثہ اور عقائد خبیثہ ہیں، حرام کھاؤ گے تو گندے اخلاق پیدا ہوں گے، گندے خیالات پیدا ہوں گے، گندے عقائد پیدا ہوں گے، اور تمہارا باطن سر سے لے کر پاؤں تک گندا ہوجائے گا۔ اس کے نتیجہ میں پھر طاعات کی توفیق سلب ہوجائے گی، نیکی کی توفیق نہ ہوگی، برائی کی طرف رغبت ہوگی۔

غرضیکہ حضرت ابودردأ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلی نصیحت یہ ہے کہ پاک چیز کھاؤ، ناپاک نہ کھاؤ، پاک کماؤ، ناپاک نہ کماؤ، ٹھگی نہ کرو، دھوکا نہ دو، فریب نہ کرو، غصب نہ کرو، چوری نہ کرو اور جتنے شرعاً ناجائز طریقے ہیں ان کو نہ کرو۔

گندے ہوکر گھر نہ آؤ:

گھر میں آؤ تو پاک ہونے کی حالت میں آؤ، گندہ ہونے کے ساتھ نہ آؤ، بداخلاقی کے ساتھ اور بداعتقادی کے ساتھ، گندہ ہوکر گھر نہ آؤ، تمہاری نظر بیوی بچوں پر پڑے گی، تو وہ بھی گندے ہوں گے۔

دن کے دن کی روزی کی دعا:

اور دوسری نصیحت یہ کہ اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا کرو کہ یا اللہ! دن کی دن روزی عطا فرما۔

قرآن کریم میں بیسویں پارہ میں پورا ایک رکوع بلکہ رکوع سے بھی زیادہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین چلے گئے تھے، ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے، مدین کے

کنویں پر دیکھا کہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے ہیں، اور دولڑکیاں اپنی بکریاں روک کر کھڑی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے فرمایا کہ: تم کیوں نہیں پلاتیں؟ فرمانے لگیں کہ: ’’لَا نَسۡقِیۡ حَتّٰی یُصۡدِرَ الرِّعَآءُ۔‘‘ یعنی ہم پانی نہیں پلاسکتیں جب تک چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلاکر واپس نہیں آجائیں، پھر جب کنواں فارغ ہوگا تو ہم بکریوں کو پانی پلائیں گی، ہم عورت ذات ہیں، مردوں کے اندر کس طرح جاکر پانی پلائیں؟ اس وقت عورت کا مرد کے شانہ بشانہ کام کرنے کا رواج نہیں چلا تھا، شبہ ہوسکتا تھا کہ تم کسی مرد کو بھیج دیتیں، تم کیوں آئیں؟ وہ کہنے لگیں کہ: ’’وَاَبُوۡنَا شَیۡخٌ کَبِیۡرٌ۔‘‘ ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں، اس لئے مجبوراً ہمیں کام کرنا پڑتا ہے، بھائی کوئی ہے نہیں، والدہ صاحبہ آنہیں سکتی ہیں، مجبوراً ہمیں کرنا پڑتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا کہ لاؤ میں پانی پلاتا ہوں، ’’فَسَقٰی لَهُمَا‘‘ ان کی بکریوں کو پانی پلادیا، قرآن کریم کے الفاظ ہیں: ’’ثُمَّ تَوَلّٰۤی اِلَی الظِّلِّ۔‘‘ پھر ہٹ کر سایہ میں بیٹھ گئے اور فرمایا: ’’رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ۔‘‘ (القصص:۲۴) پس دعا کی: اے پروردگار! جو خیر آپ میری طرف عنایت فرمائیں، میں اس کا محتاج ہوں۔

یہ ہے دن کی دن کی روٹی مانگنا، اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات ہماری عبرت کے لئے بیان فرمائے ہیں، اب یہ واقعہ میں نے اس لئے بتلایا کہ: ’’رَبِّ اِنِّیۡ لِمَاۤ اَنۡزَلۡتَ اِلَیَّ مِنۡ خَیۡرٍ فَقِیۡرٌ۔‘‘ اے پروردگار! میں محتاج ہوں، فقیر ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور حوائج بشریہ ساتھ لگی ہوئی ہیں، کھانے کی حاجت ہے، پینے کی حاجت ہے، بھوک پیاس ہے۔

میرا معمول:

میرا بھی یہ معمول ہے مجھے جب بھی کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو میں

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا کرتا ہوں: ”رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ۔“ اے اللہ! میں حاجت مند ہوں، فقیر ہوں، تیرے اتارے ہوئے رزق کا محتاج ہوں، تجھ پر نظر ہے۔

اِدھر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا کی اور اُدھر قبول ہوگئی: ”فَجَآءَتْهُ اِحْدٰهُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ۔“ ان دو میں سے ایک ان کے پاس آئی شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی قرآن نے اس کو بھی ذکر فرمایا۔ ”قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا۔“ اور آکر کہا: میرے ابا تم کو بلاتے ہیں اور تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کی جزا اور بدلہ دینا چاہتے ہیں۔

علمائے فرماتے ہیں کہ یہ الفاظ اس لئے کہے کہ ایک اجنبی آدمی سے کوئی کہے کہ آؤ میں تم کو کھانا کھلاتا ہوں تو ایک درجہ میں عیب معلوم ہوگا کہ یہ بے چارا فقیر ہے، محتاج ہے، اس کو اللہ واسطے کھانا کھلاؤ، پھر ایک غیرت مند آدمی کی غیرت اس کو قبول نہیں کرتی، اور ابا جان نے بھیجا ہوگا یہ سمجھ کر کہ وہ کسی شریف خاندان کا لڑکا ہے، اس سے مت کہنا کہ آؤ تم کو کھانا کھلائیں، بلکہ یہ کہنا کہ تمہارے احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں، خیر آگے لمبا قصہ ہے۔

تو اللہ تعالیٰ سے دن کے دن کا رزق مانگو۔ لوگ تو مزاروں پر جاتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، بزرگوں سے مانگتے ہیں، شاید اللہ تعالیٰ کے خزانہ سے ان کو نہ ملتا ہوگا، اللہ میاں نے اپنی رزاقی کا دفتر بند کردیا ہوگا، اور کہہ دیا ہوگا کہ اب ان مزار والوں سے مانگا کرو۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

اللہ کے ہاں کوئی چیز بڑی نہیں:

آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے وہ بھی اللہ سے مانگو، نمک کی چٹکی چاہیئے وہ بھی اللہ ہی سے مانگو، اور یہ نہ

سمجھو کہ چھوٹی سی چیز اللہ سے کیا مانگیں؟ اللہ بڑے ہیں ان سے کوئی بڑی چیز مانگنی چاہیئے، بات یہ ہے کہ کسی چیز کا چھوٹا ہونا یا بڑا ہونا یہ تمہارے اور ہمارے اعتبار سے ہے، اللہ کے اعتبار سے نہیں ہے، اللہ کی نظر میں سب چھوٹی بڑی چیزیں برابر ہیں، اور ہماری احتیاج کے اعتبار سے بھی برابر ہیں، ہم جس طرح جنت کے محتاج ہیں، اسی طرح نمک کی چٹکی کے بھی محتاج ہیں، ہم تو سراپا احتیاج ہیں۔

ہمارے فقر کی کوئی انتہا نہیں:

میں کبھی کبھی دعا میں کہا کرتا ہوں کہ یا اللہ! آپ کے غنا کی کوئی حد نہیں اور میرے ہاں فقر کی کوئی حد نہیں ہے، کون سی چیز ذکر کروں جس کا میں محتاج نہیں ہوں، یا جس کا میں محتاج ہوں، میں تو ایک ایک چیز کا محتاج ہوں، آپ غنی مطلق ہیں اور میں فقیر مطلق ہوں، میرے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں، کھانا پکا دیا اور پکا کر سامنے رکھ دیا، آپ تناول فرما رہے ہیں، اس کے بھی محتاج ہیں کہ اللہ پاک لقمہ کو نیچے اتار دیں، یہ ہی لقمہ اگر حلق میں پھنس جائے اور آچھو لگ جائے تو موت کا سبب بن سکتا ہے، اللہ نہ کرے، ہم کس چیز کے محتاج نہیں ہیں؟

تو بڑی چیز بھی اللہ سے مانگو اور چھوٹی چیز بھی اللہ سے مانگو، کیونکہ اللہ کی بارگاہ میں سب برابر ہیں، اس کی قدرت کے اعتبار سے سب برابر ہیں، اور ہمارے احتیاج کے اعتبار سے بھی سب برابر ہیں، اور یہ بھی بتلا دیا کہ دن کے دن کی روزی مانگو، کہو یا اللہ! آج کی روزی کا بندوبست فرما دے، آگے کی فکر نہ کرو، لمبی لمبی سوچیں نہ لے جاؤ، میں نے یہ حدیث کئی مرتبہ سنائی ہے، مشکوٰۃ شریف میں مسند احمد کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

”مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ مُعَافًى فِيْ جَسَدِهٖ وَعِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا

بِحَذَافِيرِهَا۔" (مشکوۃ ص:۴۴۳)

ترجمہ:...... "جس شخص نے صبح کی اس حالت میں کہ الحمدللہ! اس کے بدن میں عافیت ہے (عافیت ہے، تندرستی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ چلتا ہے، پھرتا ہے، بولتا ہے، کھاتا ہے، کام کرتا ہے، ٹھیک ٹھاک ہے) اپنے گھر میں دل کے اعتبار سے مطمئن ہے، کسی کا کوئی خوف نہیں، اندیشہ نہیں، اور اس کے پاس ایک دن کی روزی موجود ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: گویا ساری دنیا جمع کر کے اس کو دے دی گئی ہو۔"

کل کا دن آئے گا تو کل کا بھی اللہ تعالیٰ انتظام فرمادیں گے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں:

کارساز ما، فکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

یعنی ہمارا کارساز ہمارے کام بنانے میں خود لگا ہوا ہے، اور ہمارا اپنے معاملات و کام میں متفکر ہونا سوائے آزار کے کچھ نہیں، پریشانی ہے اور کچھ بھی نہیں، کر تو کچھ سکتے نہیں ہیں، ساری رات نیند نہیں آتی ہے فکر کی وجہ سے، کیونکہ تمہارے قبضہ میں کچھ نہیں ہے، جس کے قبضہ میں ہے وہ خود ہی کردے گا، کرنا چاہے گا تو کردے گا، تم صرف اس سے مانگو اور اگر اس کی مصلحت وحکمت میں نہ ہوگا تو نہ کرے گا، آرام سے سو جاؤ، پھر کیا پریشانی ہے؟

پریشانیوں کی جڑ تجویز ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہ فرماتے تھے کہ تمام پریشانیوں کی جڑ "تجویز" ہے، آدمی اپنے لئے ایک چیز تجویز کردیتا ہے کہ مجھے یہ چیز ملنی چاہئے، اب

اس کے لئے پریشان ہوتا ہے، تگ و دو کرتا ہے، یہ کرتا ہے، وہ کرتا ہے۔

تمام معاملات کے حل کی جڑ تفویض ہے:

فرمایا کہ تمام معاملات کے حل کی جڑ ''تفویض'' ہے، معاملہ اللہ کے سپرد کردو، اور آرام سے سوجاؤ، وہ خود ہی کرلیں گے، جس کے قبضہ میں ہے اس سے کہہ دو، اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کردو، پھر اس کی حکمت پر راضی بھی ہوجاؤ، بس راحت ہی راحت ہے۔

خدائی نہیں بندگی کرو:

اور میں کہا کرتا ہوں کہ ہم بندگی چھوڑ کر خدائی کا کام کرتے ہیں، پھر وہ ہم سے ہوتی ہی نہیں، پریشان ہوتے ہیں، بندہ کا کام صرف بندگی ہی ہے، وہ تو ہم نے چھوڑ دی، اور اس کارخانۂ عالم کو چلانا کہ اِس کو اتنا دیا جائے، اُس کو اتنا دیا جائے، اس کو نہ دیا جائے، فلاں وقت دیا جائے، فلاں وقت نہ دیا جائے، یہ خدائی ہے، بندگی چھوڑ کر جب ہم خدائی کرنے لگتے ہیں، تو وہ ہم سے چلتی نہیں۔ ساری پریشانیوں کی جڑ یہی ہے، خدا کے لئے خدائی چھوڑ دیں۔ اپنا کام ہے بندگی کا وہ کریں، مالک سے کہہ دیا یا اس کے سامنے رولو، گڑگڑا لو، جتنی تاکید کے ساتھ اور جتنی الحاح وزاری کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہو، کہنے کے بعد مطمئن ہوجاؤ، درخواست دے دی، وہ بھولتا نہیں ہے، اور یہ بھی نہیں کہ اس کو اپنے بندوں کے حال پر رحم نہ ہو، جب وہ شفیق بھی ہے، بھولتا بھی نہیں تو تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ ایک عالَم کے عالَم کو اس روزی کے مسئلہ نے پریشان کر رکھا ہے، حالانکہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، ایک دن کی روٹی اور بس، وہ مل گئی، اگلا دن آئے گا تو وہ لئے کھڑا ہے۔

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ: جس نے اگلے دن کی زندگی تمہیں دی ہے، وہ اگلے دن کی روٹی بھی تمہیں دے گا، اس لئے فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ سے مانگو وہ تم

کو رزق دیں دن کے دن۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور دعا ہے:

''اَللّٰھُمَّ اجعَلُ رِزقَ اٰلِ مُحَمَّدٍ قُوتًا۔''

(مشکوٰۃ ص:۴۴۰)

ترجمہ:...... ''یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آل، ان کے گھرانہ کی روزی دن کے دن ہو۔''

سید زادے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ تمہارے ابا میاں نے دن کے دن روزی مانگی تھی، سید ہونے پر فخر بھی کرتے ہو اور دعا سے بھی بچ کر نکلنا چاہتے ہو۔

یہ سوچو کہ آج میری موت کا دن ہے:

اور تیسری نصیحت یہ فرمائی کہ جب صبح کو اٹھو تو یہ سمجھو کہ آج میری موت کا وقت ہے، اور گویا کہ تم مُردوں میں جاکر شامل ہوگئے ہو، نفس کا علاج ہوجائے گا، ساری رذالتوں کا علاج ہوجائے گا، لیکن ہمارے دل میں یہ چیز نہیں بیٹھتی ہے۔

لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بزرگ نے کسی سے کہا تھا کہ تم سات دن میں مرجاؤگے، وہ سات دن میں نہیں مرا تو کہنے لگا کہ تم نے مجھے تو سات دن کا کہا تھا، فرمانے لگے کہ ساتویں دن میں ہی مروگے، اس لئے کہ دن صرف سات ہی ہوتے ہیں۔

موت کے انتظار کا قصہ:

جس دن مولوی منیر احمد صاحب کے والد ماجد کا انتقال ہوا، بہاول نگر میں رات کو فرما رہے تھے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ یا اللہ! میری موت دوشنبہ کو ہو، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال دوشنبہ کو ہوا تھا، تو جب سے مرغ کی اذان ہوئی اس وقت سے منتظر ہوگئے کہ ملک الموت آیا چاہتا ہے، کہنے لگے کہ: چارپائی میری قبلہ رخ کردو اور چشمہ لگایا اور بچوں سے کہا کہ کدھر سے آئے گا فرشتہ؟

اس کے منتظر بیٹھے ہیں کہ کدھر سے آئے گا؟ فرشتہ کو دیکھنے کے لئے چشمہ لگالیا۔ رات کے گیارہ بجے مجھ سے فرمارہے تھے کہ آپ جاکر سوجائیں، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوشنبہ کی موت نصیب فرمائے، اگر یہی دوشنبہ ہے تو وقت آگیا ہوگا، اور اگر نہیں تو دوشنبے (یعنی پیر کا دن) آتے ہی رہیں گے، صبح فجر کی اذان ہوگئی اسی انتظار میں ہم نے ساری رات گزاردی، مولانا جلیل احمد صاحب نے خوش ہوکر کہا کہ ابا جی! وہ آپ کا دوشنبہ تو گیا، کیونکہ وہ خوش ہوگئے تھے کہ آج ابا جی نہیں مرتے کیونکہ رات گزرگئی، مگر وہ بڑی حسرت کے ساتھ فرمانے لگے کہ فکر نہ کرو، سورج غروب نہ ہونے دوں گا، دن کے گیارہ بجے انتقال ہوا، اور یہی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت تھا۔

تو میرے بھائی! ہم سب نے سات دنوں میں مرنا ہے، کیونکہ ہفتہ میں سات ہی دن ہوتے ہیں، آٹھواں دن نہیں ہوتا، صبح کرو تو ہمیشہ خیال کرو کہ شاید آج ہی کا دن میری موت کا دن ہے، نفس بے لگام نہ ہوگا۔

اپنی عزت اللہ کو ہبہ کردو:

اور چوتھی نصیحت یہ فرمائی کہ اپنی عزت و آبرو اللہ کو ہبہ کردو، کہو کہ یا اللہ! میں نے اپنی عزت و آبرو آپ کو دے دی، جو چیز آدمی ہبہ کردیتا ہے وہ اپنی نہیں رہتی ہے، جس کو ہبہ کی اس کی ہوجاتی ہے، اپنی عزت و آبرو اللہ کے حوالے کردو، اگر تمہاری کوئی بے آبروئی کرے، توہین کرے، گالی دے، تم سے لڑے، تم کو برا بھلا کہے، اس کو اللہ کے لئے معاف کردو، اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کردو کہ میری عزت تو وہاں گئی ہوئی ہے، میرے پاس ہے ہی نہیں۔ جس آدمی کے پاس آبرو ہو، اس کی بے آبروئی ہوسکتی ہے، عزت تو اس کی ہوگی جس کی عزت ہو، اور جس کے پاس آبرو ہی نہ ہو جو اپنی آبرو کسی اور کو دے چکا ہو اس کو کیا گلہ اور کیا شکوہ و شکایت؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے، فرماتے تھے کہ:

اب کسی سے کیا شکایت؟ کیا گلہ؟
واقعاتِ زندگی خود بھول جاتا ہوں میں!

اگر کوئی شخص تمہاری بے آبروئی کرتا ہے، تمہیں گالی دیتا ہے، تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑتا، وہ گالی دے کر اپنا منہ گندا کرتا ہے، اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرتا ہے، اپنے دل کو تاریک کرتا ہے، تمہارا اس نے کچھ نہیں بگاڑا، کسی کے برا کہنے سے تمہاری بے عزتی نہ ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ: ''مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَهُ اللّٰہُ ....الخ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۴) (اگر کوئی شخص اللہ کے لئے ذلت اختیار کرے، اللہ پاک اس کو عزت عطا فرمائیں گے)۔ صرف ایک فقرہ سے سارے جھگڑے ختم ہوگئے کہ بھائی! میرے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں جو تم مانگ رہے ہو، جو چیز تم چھیننا چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں ہے، گئی ہوئی ہے، اب تم چھینتے رہو۔

شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ضبط:

مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ وعظ کے لئے کھڑے ہوئے، دشمن بہت تھے، کسی نے کھڑے ہوکر کہا مولانا سنا ہے کہ آپ حرام زادے ہیں؟ حضرتؒ نے بڑے اطمینان سے فرمایا کہ آپ کو کسی نے غلط اطلاع پہنچائی ہے، میرے ماں باپ کے نکاح کے گواہ اب تک موجود ہیں۔ اب کسی کے حرام زادہ کہنے سے کیا تم سچ مچ حرام زادے ہوگئے؟

حضرت مدنیؒ کا تحمل:

اور ٹھیک یہ ہی قصہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کو پیش آیا۔ برسر عام جلسہ میں ایک آدمی نے پرچی اور چٹ بھیجی، چٹ خود پڑھ کر

سنائی کہ ایک صاحب نے یہ لکھا ہے، لیکن ان کو غلط فہمی ہوئی ہے، میرے والد کے نکاح کے گواہ اب بھی موجود ہیں، اور میں اپنے والد کے گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ ختم ہوگئی بات!

فوراً توبہ کرنی چاہئے:

اور پانچویں نصیحت یہ فرمائی کہ جب تم سے کوئی غلطی وکوتاہی ہوجائے تو فوراً ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔

ان پانچ نصیحتوں پر عمل کرو تو انشاءاللہ دین بھی بن جائے گا اور دنیا بھی بن جائے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اعمالِ صالحہ کے عناصرِ اربعہ

گناہوں کے چھوڑنے میں انسان اپنے اختیار کو بھی بروئے کار لائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبورِ محض نہیں بنایا، اختیار کا ظاہر ہونا اتنا ہے کہ انسان تو انسان، جانوروں کو بھی اس کی اجازت ہے، دیکھئے اگر کسی کتے کو لکڑی سے مارا جائے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ہے، نہ کہ لکڑی پر، اس کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کون مختار ہے اور کون مجبور۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بزرگ توجہ فرمادیں گے ان کی برکت سے سب کچھ ہوجائے گا، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بزرگوں کی توجہ اور دعا کا انکار نہیں، بڑی مفید چیز ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

بے عنایات حق و خاصانِ حق
گر ملک است ورق او سیاہ است

یعنی اللہ تعالیٰ کی اور اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی عنایت وتوجہ کے بغیر اگر فرشتہ بھی ہوتب بھی اس کا ورق سیاہ ہے۔

کسی کی خالی دعا کچھ نہیں کرتی:

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مسجد میں عرقِ سونف پیا ادھر دھڑ ادھڑ دست ہونے شروع ہوگئے، تو کیا اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ اکیلا عرقِ سونف کافی ہے، حضرت! میری دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک خود اپنے اختیار کو کام میں نہ لائے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو بڑھ کر نہ کوئی صاحب برکت ہوسکتا ہے اور

نہ مقبول الدعوات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کیسے جان نثار اور عاشق زار تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دل و جان سے دعا کی کہ وہ مسلمان ہو جائیں، اصرار بھی فرمایا مگر چونکہ خود انہوں نے نہ چاہا، ایمان نصیب نہ ہوا۔

عزم و ہمت، عنایت الٰہی اور مقبولانِ بارگاہ الٰہی کی توجہ کی برکت:

اللہ کی عنایت اور اللہ کے مقبول بندوں کی توجہ سے کام بنتا ہے، لیکن میرا اس سے نہیں بنتا، جیسے اللہ والے کسی کو کہتے ہیں کہ فلاں کام کیا کرو، تو لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ: دعا کیا کرو، اسی طرح اگر کہا جائے کہ فلاں گناہ چھوڑ دو تو کہتے ہیں، بس! دعا کرو۔ یہ غلط ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ محض دعا و برکت سے کچھ نہیں ہوتا، دیکھو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر تو کوئی برکت والا نہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کے لئے توجہ بھی فرمائی، دعا بھی کی، لیکن ان کو ایمان نصیب نہیں ہوا، کیونکہ انہوں نے خود نہ چاہا۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ: میرے کان میں کلمہ کہہ دو، میں قیامت کے دن گواہی دوں گا۔ لیکن کان میں بھی کہنا گوارا نہ کیا، کیا مشکل کام تھا؟ صرف ابوجہل کے اس کہنے میں آگئے کہ دیکھو لوگ کیا کہیں گے کہ بڈھا مرتے وقت اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ گیا! تو چونکہ انہوں نے خود نہیں چاہا، ہمت سے کام نہیں لیا کچھ نہیں ہوا۔

جس کام کو کرنا ہو اس کو عزم اور ہمت کے ساتھ شروع کردو، پھر اللہ کے بندوں سے دعا کے لئے بھی کہو، ہم کام تو شروع کرتے نہیں مگر کہتے ہیں کہ بس دعا کرو! یہ تو مذاق اڑانا ہوا۔

عام لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ جب ہم کوئی بات کہتے ہیں، مثلاً: داڑھی کا کہتے ہیں کہ داڑھی رکھ لو! تو جواب میں کہتے ہیں جی دعا کرو! حضرتؒ فرماتے ہیں کہ شیخ اور مرید کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب اور مریض کی، اگر مریض دوا نہ پیئے تو محض

طبیب کی شفقت اور توجہ سے مریض اچھا ہوجائے گا؟ صحت تو اس کے نسخہ استعمال کرنے سے ہوگی، اسی طرح اگر بچہ سبق یاد نہ کرے تو سبق کیسے یاد ہوجائے گا؟ محض استاذ کی توجہ سے تو سبق یاد نہیں ہوسکتا، وہ تو یاد کرنے سے یاد ہوگا۔ عرض کیا گیا کہ شیخ کی برکت سے توفیق ہوجاتی ہے، فرمایا یہ تو میں کہہ چکا ہوں کہ برکت کی امید ضرور ہے، مگر کافی نہیں، اس کا دخل، دخل اعانت ہے، دخل کفایت نہیں، یعنی شیخ کی توجہ اور برکت سے توفیق ہوتی ہے، لیکن بس یہی کافی نہیں، بلکہ یہ معین اور مددگار ہے، تم عزم و ارادہ کرو، پھر شیخ دعا و توجہ سے تمہیں پیچھے سے دھکا دیں گے، لیکن اگر تم تو پاؤں گاڑ کر کے ایک جگہ جم کر کھڑے ہوجاؤ، اور بزرگوں سے کہو کہ دعا کرو کہ اللہ پاک چلنے کی توفیق عطا فرمادے، اس طرح کبھی نہیں چل سکو گے۔ بچہ سبق یاد نہیں کرتا، پڑھتا نہیں ہے، اسکول نہیں جاتا، سبق پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتا، اپنی تعلیم کا اہتمام نہیں کرتا، اور کہتا ہے دعا کرو! کیا اس سے تعلیم یافتہ ہوجائے گا؟

ہم لوگ اعمالِ آخرت کو اختیار نہیں کرتے اور دعا کے لئے کہہ دیتے ہیں۔

اصل نفع ونقصان آخرت کا ہے:

ایک صاحب یہاں تشریف لائے تھے کسی کے ساتھ جھگڑا ہوگیا تھا، تنزلی بھی ہوگئی تھی، بہت پریشان تھے، اب ان کا خط آیا ہے، اپنے پڑھنے کے معمولات بھی کچھ لکھے ہیں اور ساتھ پوچھا ہے کہ اگر کوئی وظیفہ ہو تو بتاؤ! بڑے عہدے سے چھوٹے عہدے پر ہوگئے، ترقی کے بجائے تنزلی ہوگئی، اتنے پریشان کہ ہائی کورٹ تک جا پہنچے اور مقدمہ ان کے خلاف ہوگیا، اور مجھے لکھا کہ: اب ہمارا سپریم کورٹ میں جانے کا ارادہ ہے، دنیا کا نقصان برداشت نہیں کرسکتے، وہ لکھتے ہیں کہ: لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہیں، دنیا کم ہونے سے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہیں، لیکن ہم جو اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، اور جو اعمال صالحہ کی توفیق نہیں ہوتی، اس

سے کبھی خیال نہیں ہوتا کہ اللہ پاک ناراض ہیں، اصل میں کسی اللہ والے کے پاس بیٹھے نہیں، دماغ ہی خراب ہے، ذہن بھی صحیح نہیں، اگر اسی کا نام اللہ کی ناراضگی ہے تو نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے، استغفر اللہ!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں دو دو مہینے، تین تین مہینے کھانا نہیں پکتا تھا، تو نعوذ باللہ! اللہ میاں بہت ناراض ہیں! تو خیر لوگوں کے نزدیک دنیا کا نفع، نفع ہے، دنیا کا نقصان، نقصان ہے۔

یہاں دنیاوی معاملات میں تمام اسباب و وسائل کو جمع کر کے پھر کہتے ہیں کہ دعا کرو! اور آخرت کے معاملہ میں کچھ بھی نہیں کرتے، بس کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرو! اگر کوئی کہہ بھی دے اور نصیحت کر دے تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ دعا کرو! اپنے طور پر تو کبھی بھی یہ خیال نہیں آیا کہ کسی اللہ کے بندے کے پاس جا کر کہہ دیں کہ میری آخرت درست ہو جائے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ برکت معین ضرور ہے مگر کافی نہیں، یہاں تک کہ محض دعا کی برکت تو ہرگز کافی نہیں ہوسکتی، مگر یہ ہوسکتا ہے کہ محض ہمت اور استعمالِ اختیار کافی ہو جائے۔

ایک آدمی شیخ سے تعلق رکھتا ہے اور اس آدمی کا خیال ہے کہ شیخ کی برکت سے سارا کام ہو جائے گا، ہرگز نہیں ہوگا۔

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ صرف شیخ نہیں بلکہ عزم، ارادہ اور اعمالِ آخرت کے اختیار اور برکتِ شیخ کے مجموعہ سے کام لیتا ہے، تو ان شاء اللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔

کام خود کرنا پڑے گا:

میں تو ان باتوں کو علی الاعلان کہتا ہوں، خواہ مخواہ اپنے متعلقین کو اپنا مقید بنانا نہیں چاہتا، اگر کوئی شخص اپنی اصلاح خود کرسکے، چشم ما روشن دل ما شاد! خوشی کا مقام ہے، ہمارا بوجھ ہلکا ہوا، بیعت کرنے سے مقصود تو یہ ہے کہ اپنی اصلاح ہو، اپنی اصلاح کروائیں، اپنے عیوب شیخ کے سامنے بیان کریں اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل کریں، اگر کوئی اپنے آپ اپنی اصلاح کرلیتا ہے، تو اس کو شیخ سے اصلاح لینے کی ضرورت نہیں ہے، سبحان اللہ کیا بات ہے! بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہمارا تو بوجھ ہلکا ہوگیا، ایک دن میں بیس خطوط لکھنے کے بجائے اگر دس خط لکھنے پڑیں تو مجھے خوشی ہوگی، اور دس کے بجائے بیس لکھنے پڑیں تو کام بڑھے گا، اور دوسرا جھگھٹا جتنا زیادہ ہوگا، ہم پر بوجھ ہی بڑھے گا، ہم تو چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس کوئی بھی نہ آئے، اپنا اللہ اللہ کیا کریں، اسی لئے میں شروع میں بیعت کرتا بھی نہیں تھا، بزرگوں نے زبردستی حکم دیا۔

بیعت کے انکار کی وجہ:

مکہ مکرمہ میں ہمارے شیخ رحمہ اللہ کے بڑے خلیفہ ڈاکٹر اسماعیل صاحب نے مجھے کہا کہ سنا ہے تم بیعت کرنے سے لوگوں کو انکار کردیتے ہو؟ میں نے کہا کہ بے وقوف ہیں لوگ جو میرے پاس آتے ہیں، کسی عالم کے پاس جائیں، انکار تو اس لئے کرتا ہوں کہ کسی اچھے آدمی کے پاس چلے جائیں گے، ان کا کام ہوجائے گا۔ میری اس بات سے ڈاکٹر اسماعیل صاحب بہت ناراض ہوئے، فرمایا کہ تم اپنے شیخ سے خیانت کرتے ہو، میں نے کہا کہ آئندہ ایسا نہیں کروں گا، تو واللہ العظیم! جی چاہتا ہے کوئی بھی نہ آئے، کسی اچھے آدمی کے پاس چلے جائیں، اس لئے جب کوئی بیعت ہونے کے لئے کہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ حکیم اختر صاحب ہیں، ان کے پاس چلے

جاؤ، مفتی رشید احمد صاحب ہیں، ڈنڈے والے پیر، ان کے پاس چلے جاؤ، مولانا تقی عثمانی صاحب ہیں، ان کے پاس چلے جاؤ، دوسرے بہت سے اکابر ہیں، کوئی پنجاب کا ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ تمہارے علاقہ میں حضرت نفیس شاہ صاحب ہیں، ان سے تعلق رکھو، تو ہمیں تو خوشی ہے کہ لوگ نہ آئیں، ہمارا بوجھ ہلکا ہو، لیکن اس کا افسوس ہے کہ آئیں بھی اور کچھ لے کر بھی نہ جائیں۔

میں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ کمزور ماں باپ کی اولاد بھی کمزور ہوا کرتی ہے، ہم کمزور ہیں، ہم سے استفادہ کوئی کیا کرے گا؟ وہ بھی کمزور ہی ہوگا، کسی اچھے اور بڑے آدمی کے پاس چلے جاؤ۔

تو بھائی! اگر کوئی شخص اپنی اصلاح خود کرسکتا ہو تو سبحان اللہ! اس سے اچھی کیا چیز ہے؟ لیکن یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ بیعت کا تعلق بھی ہے اور کوئی اصلاح میں ترقی بھی نہیں ہے، جہاں پہلے دن تھے، وہیں کھڑے ہیں، کوئی ترقی نہیں کی، ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔

شیخ کا کام:

عرض کیا گیا کہ یہ تقریر کہیں اس کے خلاف تو نہ ہوگی:

بے رفیق ہر کہ شد در راہ عشق
عمر بہ گزشت ونشد آگاہ عشق

یعنی جو شخص رفیق کے بغیر عشق کے راستے میں قدم رکھے، عمر بیت جائے گی لیکن عشق کا پتہ نہیں چلے گا۔

عشق بازی مرید کا کام ہے:

تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ضرورت ہی نہیں ہے پیر کی، خود ہی کام کرتے رہو۔ عرض کیا گیا کہ اس کے خلاف تو نہیں آپ کی یہ بات۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ:

خلاف کیوں ہو یہ تو اور ہماری معیت ہے، آگاہ عشق فرمایا یعنی بغیر عشق کے آگاہ نہیں ہوگا، لیکن یہ عشق سے آگاہ ہونا، عشق تو یہ خود کرے گا، اس کی جگہ اس کے شیخ تو نہیں کریں گے، عشق بازی تو یہ خود کرے گا۔ شیخ کے ذمہ تو عشق کا راستہ بتانا ہے، عشق خود کرلو، شیخ معشوق کا پتہ بتادے گا۔

رگڑ سے گرمی پیدا ہوگی:

حضرت ذکی الامتؒ، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں گئے، یہ بہت معمر بزرگ تھے، ان سے کہنے لگے کہ حضرت کوئی طریقہ بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجائے، فرمایا کہ: اپنے ہاتھ کو رگڑو اور اس طرح ملو، شیخ کا حکم تھا حضرت ذکی الامتؒ ہاتھ ملنے لگے، فرمایا کہ اور زیادہ زور سے ملو، انہوں نے ملا، فرمایا کہ کچھ گرمی پیدا ہوئی؟ کہا: جی! فرمایا: ایسے ہی رگڑتے رگڑتے گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔ بس شیخ نے راستہ بتلادیا، بھائی! اللہ کے راستہ پر چلنے سے پہلے ہی دن ولی اللہ نہیں بن جاؤ گے، اور پہلے ہی دن مکاشفے نہیں ملنے لگیں گے، لیکن زور سے رگڑتے رہو گرمی پیدا ہوگی، اللہ کے راستے پر چلتے رہو گے تو تعلق مع اللہ بھی پیدا ہوجائے گا، اور یہی آگاہ عشق ہونا ہے، عشق سے آگاہ ہونا ہے۔ بلا شیخ کے آگاہ نہ ہوگا، علم کا درجہ حاصل نہ ہوگا شیخ اس کا راستہ بتلائے گا، یہ مطلب نہیں کہ شیخ اس کو گھسیٹ کر لے چلے، اندھے کو آنکھوں والا راہ بتلاتا ہے، گود میں اٹھا کر تو نہیں لے جاتا، جیسے کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو، نابلد ہے، اس کو کہتے ہیں کہ اس طرف چلے جاؤ، کبھی انگلی بھی پکڑ لیتے ہیں، لیکن گود میں تو نہیں اٹھاتے کہ حافظ جی کو چلنا نہ پڑے، حافظ جی کو تو چلنا خود ہی پڑے گا۔ اس لئے یہ خیال کرلینا کہ بس بیعت کا تعلق کافی ہے، کام وغیرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، خود ہی سب کام ہوجائے گا، یہ غلط ہے، راستہ بتلانا تو بے شک شیخ کا کام ہے، لیکن راستہ کا طے کرنا تو اسی کے ذمہ ہے۔

ایک نشست میں خدا تک پہنچانا:

حضرتؒ کا ایک پرانا ملفوظ یاد آ گیا کہ ایک صاحب کو بہت مفصل طور پر راہِ سلوک بیان کرتے ہوئے فرمایا: الحمدللہ! میں تو طالب کو ایک ہی جلسہ میں خدا تک پہنچا دیتا ہوں، کیونکہ مقصود کی حقیقت کو بتلا دینا گویا مقصود تک پہنچا دینا ہے، اگر کوئی راستہ بتلا دے اور کہہ دے کہ دیکھو وہ چراغ جل رہا ہے، تو یہ گویا اس کو چراغ ہی تک پہنچانا ہے، اب صرف راستہ قطع کرنا باقی ہے، یہ طالب کا کام ہے، قدم اٹھاتا جائے مقصود تک پہنچ جائے گا۔ فرمایا کہ میں تو ایک ہی جلسہ میں طالب کو مقصود تک پہنچا دیتا ہوں۔

مقصود تک پہنچانے کے معنی راستہ دکھلانے کے ہیں، ایک بات تو صاف ہوگئی، طے ہوگئی کہ یہ کرنا ہے۔

حصولِ مقصد کے انداز:

اب آدمی کو بہت دفعہ یہ پریشانی ہوتی ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ مجھے راستہ کیسے قطع کرنا ہے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ میں تو ایک جلسہ میں مقصود تک پہنچا دیتا ہوں، راستہ دکھلا دیتا ہوں، دور سے دکھا دیا کہ وہ چراغ جل رہا ہے، رات کا وقت ہے، وہاں پر پہنچ جاؤ، اب راستہ اس کو قطع کرنا پڑے گا، چاہے رینگتا ہوا چلے، آہستہ آہستہ چلے اور چاہے فوراً بھاگتا ہوا چلا جائے۔

سوکھی اور گیلی لکڑیاں:

ایک بزرگ تھے ان کے پاس ایک عالم بیعت ہوئے، چند دن رہے خلافت لے کر چلتے بنے، ان کے دوسرے مرید خانقاہ میں برسوں سے پڑے ہوئے تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم اتنے عرصہ سے پڑے ہوئے ہیں، ہمیں تو کچھ نہیں ملا، اور یہ صاحب آئے اور خلافت لے کر بھی چلے گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ درخت کاٹ کر لاؤ، مریدین شاخیں کاٹ کر لائے، فرمایا کہ جلاؤ، اب جلائیں کیسے؟ کیونکہ درخت کی

شاخیں گیلی ہیں، ان سے پانی ٹپکتا ہے، وہ دھواں سا ہوتا رہا اور آگ نہیں جلی، پھر شیخ نے خشک لکڑیاں منگوائیں اور لکڑیاں بھی تیل کی، ان کو دیا سلائی دکھلا دی فوراً جلنے لگیں، اس بزرگ نے فرمایا: تمہاری مثال گیلی لکڑیوں کی تھی، اتنے دنوں سے تمہارا پانی خشک کر رہا ہوں، ابھی تک وہی خشک نہیں ہو رہا، دھواں ہی اٹھ رہا ہے، اور ان صاحب کی مثال اس سوکھی لکڑی کی ہے جس میں تیل موجود ہے، صرف دیا سلائی دکھلانی تھی وہ دکھلا دی کام ہو گیا، عشق کی آگ جل پڑی۔

خواہشات گیلی لکڑیاں ہیں:

یہ گیلی لکڑیاں کیا ہیں؟ نفسانی خواہشات ہیں، ماحول کے تأثرات، ماحول کی آب و ہوا، جب تک ہم اپنی ہوا و ہوس سے گزر کر اللہ کے راستہ میں قدم نہیں رکھتے، اس وقت تک کام نہیں چلے گا، اگر تھوڑا بہت کام کریں گے بھی، تو بس دھواں ہی نکلے گا، آگ نہیں جلے گی، نہ تپش پیدا ہوگی اور نہ روشنی پیدا ہوگی، آگ کی دو خاصیتیں ہیں: ایک تو تپش ہوتی ہے جو کہ اس کی اصلی خاصیت ہے جیسا کہ کسی بزرگ کا قول ہے:

جو آگ کی خاصیت وہی عشق کی خاصیت
ایک خانہ بہ خانہ ہے ایک سینہ بہ سینہ ہے

آگ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتی ہے، اور عشق ایک سینہ سے دوسرے سینہ میں منتقل ہوتا ہے۔ گرمی اور روشنی۔ تو جب تک اپنی خواہش سے آدمی نہیں گزرے گا، اور ہوا و ہوس کو ترک نہیں کرے گا اور عزم کے ساتھ اللہ کے راستہ پر قدم نہیں رکھے گا، کام کس طرح چلے گا؟ ہمت کرلو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمت اور استقلال سے کام لو، عزم، ہمت اور استقلال سے کام لو۔ نیک کاموں کے کرنے اور گناہوں کے چھوڑنے کا عزم کرلو، پھر ہمت سے

کام لو اور پھر استقلال اختیار کرو، ایک دو دن کی تو بات نہیں ساری عمر کا چکر ہے، بس یہ تین لفظ ہیں انشاءاللہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

گناہوں کو چھوڑنے کی ترکیب:

ہمارے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ میں گناہوں کی تین قسمیں کرتا ہوں:

۱:......ایک گناہ وہ ہیں جن کو تم چھوڑ سکتے ہو، ان کو چھوڑ دو، تمہاری ذات سے تعلق رکھتے ہیں ناں! چھوڑ دو، کیا نقصان ہوتا ہے؟

۲:......اور ایک گناہ ایسے ہیں جن کو فوراً نہیں چھوڑ سکتے، ان میں ارادہ کرلو کہ چھوڑ دیں گے انشاءاللہ، اب اللہ سے مانگتے رہو۔

۳:......اور تمہارے خیال میں بعض گناہ ایسے ہیں کہ تم ان کو چھوڑ نہیں سکتے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے لئے کم سے کم اتنا تو کرو کہ اللہ سے یوں کہو کہ یا اللہ! میں ان گناہوں کو چھوڑنا چاہتا ہوں مگر چھوڑ نہیں سکتا، یا اللہ! یا تو آپ چھڑا دیجئے یا پھر عذاب نہ دیجئے، اس پر پکڑ نہ فرمایئے۔ اپنے قصور کا اعتراف کرلو اور اللہ تعالیٰ سے یہ کہتے رہو انشاءاللہ! اللہ تعالیٰ چھوڑنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔

لیکن جو گناہ ہمارے اختیار میں ہیں، ہم نے کبھی ایک گناہ کے چھوڑنے کا عزم بھی نہیں کیا اور یہی بات نیک اعمال کے بارے میں ہے، جو فرائض و واجبات فوری طور پر ادا کرنے کے ہیں، ادا کرو، اور جن پر عمل نہیں ہوسکتا، ان کے لئے نیت رکھو اور دعا بھی کرو کہ انشاءاللہ ان پر عمل کریں گے، اور کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جن کو ہم اختیار ہی نہیں کرسکتے، وہاں اپنی کوتاہی و تقصیر کا اعتراف کرلو، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، آمین! خلاصہ یہ ہے کہ عزم، ہمت اور استقلال ان تین چیزوں سے کام لو۔

انسان مجبورِ محض نہیں:

ان گناہوں کے چھوڑنے میں انسان اپنے اختیار کو بھی بروئے کار لائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبورِ محض نہیں بنایا، اختیار کا ظاہر ہونا اتنا ہے کہ انسان تو انسان، جانوروں کو بھی اس کی اجازت ہے، دیکھئے اگر کسی کتے کو لکڑی سے مارا جائے تو وہ مارنے والے پر حملہ کرتا ہے، نہ کہ لکڑی پر، اس کو بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کون مختار ہے اور کون مجبور۔

جبر و قدر کی حقیقت:

ہر شخص اپنے وجدان کو ٹٹول کر دیکھ لے کہ جب کوئی ناشائستہ حرکت کرتا ہے تو اس کو خجالت ہوتی ہے، اگر وہ اپنے کو مجبور سمجھتا تو پھر خجلت کیوں ہوتی ہے؟ خجلت تو اپنے اختیاری فعل پر ہی ہوسکتی ہے، لہٰذا یہ یقینی ہے کہ انسان مختار ہے، اور یہ مسئلہ اختیار اس قدر ظاہر ہے کہ ہر شخص اپنے اندر صفات اختیار کو وجداناً اور طبعاً محسوس کرتا ہے، حتیٰ کہ جو جبری ہیں وہ بھی محض قولاً جبری ہیں، وجداناً وہ بھی اختیار کے قائل ہیں، کسی کو اس سے مجالِ انکار نہیں۔

عدم علم، عدم شئ کی دلیل نہیں:

پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کی کنہ (حقیقت) کسی کو معلوم ہے اور نہ معلوم ہوسکتی ہے، مگر کسی شئے کے معلوم نہ ہونے سے اس کے وجود کا انکار نہیں کیا جاتا، مثال کے طور پر ضیاءٗ اور روشنی کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، حالانکہ اس کا وجود بالکل واضح اور مشاہد ہے، کیا اس کے وجود کا انکار کیا جاسکتا ہے؟

جبر و قدر کی حقیقت:

حضرت مولانا رومیؒ نے نہایت سادہ اور سہل عنوان سے اس مسئلہ جبر و

اختیار کو بیان فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

زاریٔ معشوق دلیل اضطرار
وخجلت معشوق دلیل اختیار

اگر اضطرار نہیں تو یہ زاری کیوں ہے؟ اور اگر اختیار نہیں تو اپنے کئے پر شرمساری کیوں ہے؟

غرض نہ خالص جبر ہے اور نہ خالص اختیار، اختیار خالص نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ ماتحت ہے اختیار حق کے، مستقل اختیار نہیں۔

اپنے اختیار کو استعمال کئے بغیر اصلاح نہ ہوگی:

بہرحال انسان میں صفت اختیار کا ہونا قطعی ہے، جب یہ ہے تو اپنی اصلاح کرنے میں بھی اس صفت کو اختیار کرنا چاہئے، جب تک نہ کرے گا، اصلاح نہ ہوگی۔ مثلاً کسی میں بخل ہے تو کیا میرے ذکر وشغل سے یا شیخ کی دعا کی برکت سے یہ رذیلہ زائل ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! یہ رذیلہ تو نفس کی مقاومت ہی سے زائل ہوگا، البتہ ذکر و شغل معین ضرور ہوجائیں گے مگر کافی نہیں ہوں گے، حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ جابجا اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

کارکن کار گفتار قندری از کار باید کار

کام کرنے سے ہی کام چلتا ہے، نیک تمناؤں اور نیک دعاؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ اپنی اصلاح کرنا، نیکیوں کا حاصل کرنا، برائیوں سے بچنا، دل کے اندر جو گندے اخلاق ہیں ان سے اپنے آپ کو پاک کرنا، اچھے اخلاق کا پیدا کرنا، یہ تمام کی تمام چیزیں اختیاری ہیں، انسان کے اختیار میں ہے، یوں کوئی بہانہ کرنے کے لئے کہے کہ انسان مجبور ہے تو یہ غلط کہتا ہے، انسان مجبور نہیں۔

جانور بھی جانتے ہیں کہ انسان صاحبِ اختیار ہے:

اکابر فرماتے ہیں کہ انسان کا صاحب اختیار ہونا اتنی واضح چیز ہے، اتنی کھلی ہوئی چیز ہے کہ آدمی تو آدمی، جانور بھی اس کو جانتے ہیں، کتے کو ماریں گے تو مارنے والے کو بھونکتا ہے، لکڑی کو نہیں بھونکتا، مارنے والے پر ہی حملہ کرتا ہے لکڑی پر نہیں کرتا، کتا بھی جانتا ہے کہ لکڑی بے جان ہے، یہ اپنے آپ نہیں چلتی، اس کو کوئی چلانے والا چلاتا ہے، اور انسان جس کے ہاتھ میں لکڑی ہے وہ صاحب اختیار ہے۔

تو معلوم ہوا کہ جانور بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ انسان صاحب اختیار ہے، مجبورِ محض نہیں ہے۔

اختیار کی حقیقت ہماری سمجھ سے باہر ہے:

خیر اتنی بات صحیح ہے کہ انسان بااختیار ہے، رہا یہ کہ انسان کے اختیار کی حقیقت کیا ہے؟ یہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کوئی اس کو نہیں سمجھ سکتا اور اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

روح کی حقیقت ہماری سمجھ سے بالا ہے:

میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ انسان کے اندر جان ہے اور یہی جان مردہ اور زندہ کے درمیان فرق کرتی ہے، زندہ آدمی میں جان ہوتی ہے اور جب جان نکل جاتی ہے تو آدمی مرجاتا ہے، لیکن جان اور روح کیا چیز ہیں؟ کوئی اس کی حقیقت کو نہیں جانتا، حکماءٔ بھی عاجز آگئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ سوال ذکر کیا ہے:

”وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔“ (بنی اسرائیل:۸۵)

ترجمہ:......”وہی آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں روح کے بارے میں کہ روح کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ فرمادیجئے کہ روح میرے

رب کے امر سے ہے، اور تم کو نہیں دیا گیا علم مگر بہت تھوڑا۔‘‘

اس تھوڑے علم کے ساتھ تم روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے ہو، چنانچہ تمام حکمائ، تمام سائنسدان، تمام عقلاءآج تک روح کی حقیقت کے جاننے سے قاصر ہیں، میری اور آپ کی کیا بات ہے؟ زندہ اور مردہ کے درمیان فرق ہونا اس کو ہر شخص جانتا ہے، اور یہ بات کہ زندگی روح اور جان کے ساتھ ہے، اور موت روح اور جان کے نکالنے کا نام ہے اس کو بھی ہر شخص جانتا ہے، لیکن جان ہے کیا چیز؟ روح کس چیز کا نام ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔

دوسری مثال:

حضرتؒ نے دوسری مثال بیان فرمائی ہے نور کہو یا روشنی کہو یا ضیأ کہو، اس کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا، بتاؤ روشنی کس کو کہتے ہیں؟ ظلمت یعنی تاریکی، اندھیرا اس کی ہم تعریف کرتے ہیں عدم نور کے ساتھ، روشنی کا نہ ہونا اندھیرا ہے، روشنی کے نہ ہونے کا نام ہے اندھیرا، تاریکی، لیکن مطلق روشنی کیا چیز ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بتلانے سے عاجز ہیں لوگ۔ اطبأ، حکمأ، سائنسدان وہ بھی اس کی تعریف نہیں کرسکتے ہیں، بتائیں روشنی کس چیز کا نام ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

تو کیا محض اس وجہ سے کہ ہم روشنی کی حقیقت نہیں جانتے، روشنی کا انکار کرلیا کریں کہ روشنی کوئی چیز نہیں ہے۔ جو شخص یہ کہے کہ روشنی کوئی چیز نہیں ہے، اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ اندھا ہے، زیادہ سے زیادہ جو تعریف کی گئی ہے نور کی وہ یہ ہے کہ: جو چیز خود روشن ہو، اور اس کی وجہ سے دوسری چیزیں روشن ہوں، بس یہ تعریف ہم کرتے ہیں، لیکن یہ کوئی حقیقت نہیں، حقیقت تک ہم نہیں پہنچے۔

تو جس طرح کہ روح کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت نہیں جانتے، اور روشنی کو اور نور کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت نہیں جانتے، اسی طرح انسان

کا مختار ہونا یعنی صاحب اختیار ہونا اس کو سب جانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ نہیں جانتے۔ انسان مختار ہے یا مجبور ہے؟ اس میں لوگ بہت بھٹکے ہیں۔

بعضوں نے کہا کہ انسان مجبور ہے، جبری بن گئے۔ بعضوں نے کہا کہ انسان مختار مطلق ہے، یہ بھی بھٹک گئے۔ حالانکہ انسان نہ مجبورِ محض ہے، پتھر لکڑی کی طرح اور نہ یہ صاحب اختیار ہے من کل الوجوہ، مطلق طور پر، بلکہ معاملہ بیچ بیچ میں ہے۔

جبر وقدر حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں:

حضرت تھانویؒ سے کسی شخص نے یہ جبر و اختیار کا مسئلہ پوچھا تھا، حضرتؒ نے فرمایا کہ: ایک ٹانگ اٹھاؤ، ایک پاؤں اٹھاؤ، اٹھالیا، فرمایا کہ دوسرا بھی اٹھالو، کہا کہ حضرت جب ایک پاؤں رکھوں گا تو دوسرا اٹھاؤں گا، بغیر اس کے کیسے اٹھالوں؟ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ بس اتنا اختیار ہے اور اتنی مجبوری، اختیار بھی ہے اور جبر بھی ہے۔

جبر وقدر مولانا رومیؒ کے الفاظ میں:

مولانا رومیؒ نے مثنوی شریف میں بہت ہی خوبصورت الفاظ میں اس کو بیان فرمایا کہ انسان مجبور بھی ہے اور انسان مختار بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

زاریٔ معشوق دلیل اضطرار
و خجلت معشوق دلیل اختیار

جب کوئی تکلیف ہوتی ہے، مصیبت ہوتی ہے، روتے ہیں، چلاتے ہیں، بلبلاتے ہیں (حضرت! اگر قادرِ مطلق تھے تو روتے کیوں ہیں؟ قادرِ مطلق بھی رویا کرتا ہے؟ خدا تعالیٰ کو بھی کیا رونا آتا ہے، نعوذ اللہ!) ہم تو ایک کام کرتے ہیں، کام کرنے کے بعد خود شرمندہ ہوتے ہیں، شرمندگی ہوتی ہے، اگر اختیار ہوتا تو شرمندگی

کیوں ہوتی؟ تو معلوم ہوا کہ آدمی نہ من کل الوجوہ مختار ہے، اور نہ اپنے سے جبری ہے، یعنی مجبورِ محض ہے، بلکہ بیچ بیچ میں معاملہ ہے۔مولانا رومیؒ چٹکیوں میں مسائل حل کردیتے ہیں۔

جبری کی اصلاح کا ایک قصہ:

ایک جگہ اس جبر وقدر کے مسئلہ پر بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کہیں چلا گیا تھا، باغ سے پھل توڑ کر کھانے لگا، باغ کے مالک نے اپنے نوکر کو بھیجا کہ اس سے کہو کہ پرائے مال میں سے بغیر پوچھے کیوں پھل کھاتا ہے؟ غلام اس کے پاس آیا اور یہ بات کہی کہ مالک کی اجازت کے بغیر پھل توڑتے ہو، کھاتے ہو، یہ تو ٹھیک نہیں ہے، وہ کہنے لگا کہ باغ بھی خدا کا، پھل بھی خدا کا، اور میں بھی خدا کا، تو روکنے والا کون ہوتا ہے؟ باغ کے مالک نے سن لیا کہ یہ جبری ہے، نوکر کو حکم دیا کہ ایک رسّہ لاؤ، اور ایک ڈنڈا بھی لاؤ، رسّہ کے ساتھ اس کو باندھ دیا اور ڈنڈے کے ساتھ پٹائی کرنے لگا، اب جب ڈنڈا برسے گا تو ہائے، ہائے تو نکلے گی، باغ کا مالک کہنے لگا کہ تو بھی خدا کا، رسّہ بھی خدا کا، ڈنڈا بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا، ہائے، ہائے کیوں کرتا ہے؟ تو یہ کہنے لگا:

توبہ کردم از جبر اے عیار!
اختیار است اختیار است اختیار

میں جبر کے عقیدہ سے توبہ کرتا ہوں، اختیار کا قائل ہوں، اختیار ہے، اختیار ہے، اختیار ہے۔

بڑی غلطی:

یہ بڑی غلطی ہے کہ ہم لوگ اپنے کرنے کا کام تو کرتے نہیں، اور جو کرنے کا نہیں ہے اس میں الجھتے ہیں، بہت سے لوگ مجھے خطوط لکھتے ہیں، اس میں یہی

اختیار اور جبر کا مسئلہ پوچھتے ہیں، کبھی اپنے کرنے کی بات بھی پوچھی کہ میرے کرنے کا کام کیا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیوں ہو رہا ہے؟ دنیا میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ حافظ شیرازیؒ نے اسی لئے نصیحت کی تھی کہ:

حدیث مطرب و مے گو
راز دہر کم تر جو
درحکمت کس لب نہ کشاید
حکمت ایں معما را

مطرب و مے کی باتیں کرو، اللہ و رسول کی باتیں کرو، اپنے عمل کی باتیں کرو، جن چیزوں کا تعلق تمہارے دائرۂ اختیار سے ہے، اس کے بارے میں بات کرو اور زمانے کے راز کم ڈھونڈا کرو کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیوں ہو رہا ہے؟ ایسا کیوں ہوگا؟ ویسا کیوں ہوگا؟ اس لئے کہ یہ ایک ایسا معما ہے، حکمت کے ساتھ نہ کوئی اس معما کو حل کرسکا اور نہ ہی کرسکے گا۔ یہ تمہاری حکمت و دانائی سے بالاتر چیز ہے، تم اپنا کام کرو۔

خدائی معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں:

بہت سے لوگ نہایت ہی مہمل سوالات کرتے ہیں، اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، دوسرے کا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، مجھے بہت افسوس اور صدمہ ہوتا ہے، بہت کم لوگ ہوں گے جو اپنی ذات کے بارے میں پوچھتے ہوں۔ سو میں سے دس آدمی بڑی مشکل سے ملیں گے جو شرعی مسئلہ اپنی ذات کے لئے پوچھتے ہوں، یہاں وہاں کی ہانکتے ہیں، لوگوں کی باتیں کرتے ہیں، اپنی نہیں کرتے۔ یہی لوگ خدائی معاملات میں ٹانگ اڑاتے ہیں، اللہ نے ایسا کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ مرد کو مرد اور عورت کو عورت کیوں بنایا؟ جواب دو، کتے کو کتا اور بلی کو بلی کیوں بنایا؟ کوئی حکمت

کے ساتھ اس معما کو حل کر سکے گا؟

میں ایک ہی لفظ لکھ دیتا ہوں کہ تم بندے ہو، بندگی کے آداب سیکھو، خدائی کو خدا پر چھوڑ دو، خدائی کرنا وہ خود جانتا ہے، اس کو تمہارے مشورہ کی ضرورت نہیں ہے۔

میں اگر کوئی بات ہانک بھی دوں تو اس سے کیا خدائی کا معما حل ہو جائے گا؟ اسی طرح یہ جبر و قدر کا مسئلہ ہے، تقدیر کا مسئلہ ہے، یہ میرے آپ کے طے کرنے کی بات نہیں ہے، اتنا جانتے ہو کہ انسان مختار ہے، اچھا کام کرتے ہو تو طبیعت خوش ہوتی ہے، برا کام کرتے ہو تو طبیعت بدمزہ ہوتی ہے، دل میں خود شرمندہ ہوتے ہو، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو فاعل مختار سمجھتے ہیں، اور اچھا کام کرکے خوش ہونا اور برا کام کرکے برائی ہو جائے تو طبیعت کا بدمزہ ہونا، یہ ایمان کی علامت ہے۔

ایک صاحب نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کیسے پتہ چلے کہ میں مؤمن ہوں؟ فرمایا کہ:

"اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَائَتْکَ سَيِّاٰتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۶)

ترجمہ:...... "جب تیری نیکی تجھے خوش کرے اور تیری برائی تجھے بری لگے بس تو مؤمن ہے۔"

نیکی پر فرحت ہو نہ کہ ناز:

نیکی کا کام کرکے طبیعت میں فرحت پیدا ہو، ناز نہ کرے، ناز اور چیز ہے، دل میں فرحت کا پیدا ہونا اور چیز ہے۔ کسی آدمی نے نماز پڑھی اور اللہ نے توفیق دی نماز پڑھی، اچھی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ سے باتیں کیں، خوب دعا مانگی تنہائی میں، دل میں ایک خاص خوشی پیدا ہوجاتی ہے، خاص فرحت پیدا ہوجاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ طبیعت کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ یہ ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تیری نیکی تجھ کو خوش کردے، اور بطور فخر کے بیان کرنا یہ بے ہودگی ہے، اس کو بیان کرنا یہ بے ہودہ کام ہے۔ دل میں فرحت کا پیدا ہوجانا اچھا کام کرکے، نیکی کا کام کرکے اور خدانخواستہ کوئی غلطی ہوگئی، گناہ ہوگیا، برائی ہوگئی تو دل میں غم پیدا ہوجائے، یہ علامت ایمان کی ہے۔

اور اگر نیکی کا کام کرکے خوشی نہیں ہوتی، اور گناہ کا کام کرکے طبیعت بدمزہ نہیں ہوتی تو معلوم ہوتا ہے کہ چپٹ ہے سب کچھ، اندر کا جو دل ہے یہ اندھا ہوگیا ہے بے چارا، اس میں تأثر ہی نہیں رہا۔

انسان کو امورِ اختاریہ کا مکلّف بنایا گیا ہے:

تو خلاصہ یہ کہ آدمی میں اختیار ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیاری امور ہی کا مکلّف کیا ہے، نماز ہے، روزہ ہے، نیکی کے کام ہیں، ان کے کرنے کا حکم فرمایا، انسان قادر ہے، انسان کو ان امور پر اختیار ہے، اگر اختیار نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کبھی بھی مکلّف نہ فرماتے، اور گناہ کے جتنے بھی کام ہیں ان کے چھوڑ دینے کا اختیار ہے، ہم اپنے نفس کو دھوکا دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ مجھے اس کام کے چھوڑنے کا اختیار نہیں ہے، میں چھوڑ نہیں سکتا، ٹھیک ہے، آپ ٹھیک کہتے ہوں گے کہ میں ان کو چھوڑ نہیں سکتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو کہا کہ چھوڑ دو، اور یہ تو نہیں کہ دو سال کے چھوٹے بچے کو اللہ تعالیٰ دو من کے بوجھ اٹھانے کا حکم دے دیں کہ اٹھاؤ! اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ دو من چھوٹے بچے سے نہ اٹھے گا، اسی طرح جتنے کاموں کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے، وہ ہمارے اختیار میں ہیں، ہم اس کو کرسکتے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ہمیں کبھی حکم نہ فرماتے۔ اور جتنے کاموں کے چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے ہم اس کے چھوڑنے پر قادر ہیں۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے چھوڑنے کا حکم نہ دیتے، یہ جانتے ہوئے کہ معذور ہیں،

قرآن کریم میں ہے: ”لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔“ یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہیں بناتے۔

جب یہ بات طے ہوگئی کہ وہ تمام نیکی کے کام جن کے کرنے کا ہمیں حکم فرمایا ہے، اور گناہ کے کام جن سے باز رہنے کا حکم فرمایا ہے، ان کا کرنا اور ان کا چھوڑنا ہمارے اختیار میں ہے، تو اب دعا اور وظیفہ سے تو کام نہیں چلے گا۔ ہمت سے کام لینے سے کام چلے گا، ہمت سے کام لو۔

حاصل سلوک وتصوف:

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تمام کا تمام تصوف اور سلوک صرف اسی ایک لفظ میں ہے کہ اپنے اختیاری امور میں ہمت سے کام لو، ہاں ذکر و اذکار، وِرد و وظائف، دعا اور التجا، شیخ کی توجہ اور عنایت، یہ چیزیں معین اور مددگار بنتی ہیں، لیکن اصل کام استعمالِ اختیار سے چلے گا، اور اگر کوئی شخص اپنے اختیار سے تو کام نہ لے، ہمت اور عزم کسی کام کے کرنے اور چھوڑنے کا نہ کرے، اور یہ کہتا رہے کہ کوئی وظیفہ بتلادو نماز قضا نہ ہوا کرے، تو تم بتلاؤ جو وظیفہ مانگتا ہے وہ کیا کام کرے گا؟ کوئی وظیفہ بتلاؤ کہ میرے اندر تکبر نہ رہے، میرا بھائی! اس کا علاج کرواؤ، بیماری ہے، صرف وظیفہ پڑھنے سے تو پیٹ کا درد نہیں جائے گا، علاج کرو، میرے اندر بخل کا مادہ نہ رہے، حسد نہ رہے، کینہ نہ رہے اور جتنے نفسانی رذائل ہیں وہ ختم ہوجائیں، محض وظیفہ پڑھنے سے تو یہ ختم نہ ہوں گے، شیخ کی ضرورت اسی لئے پیش آتی ہے کہ وہ ان رذائل کا علاج بتلائے، اور شیخ کی تجویز کے مطابق تم عمل کرو، اور اس کو اطلاع دیتے رہو۔

تشخیص وتجویز حاصل تصوف:

حضرتؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سلوک کا خلاصہ دو لفظ میں کردیا ہے: تشخیص اور تجویز۔ اپنے حالات شیخ کے سامنے رکھو وہ تشخیص کرے گا کہ کون سا مرض ہے؟ خود

اپنے پاس سے نہ گھڑو، تم اپنے امراض کی صحیح تشخیص بھی نہیں کر سکتے ہو، شیخ اگر محقق ہوگا تو وہ تشخیص کر سکے گا کہ یہ کون سی بیماری ہے؟

حیا اور کبر کا فرق:

میں نے ایک دفعہ اپنے حضرتؒ کو ایک بات لکھی تھی کہ: ''یہ کام کرتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، آیا یہ کبر ہے؟'' حضرتؒ نے فرمایا (میرے پاس وہ خط محفوظ ہے) یہ کبر نہیں، حیا کہلاتی ہے، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم کو کوئی ہاتھی پر سوار کردے، ہاتھی پر سوار ہوکر کے بدل جاؤ گے، بلکہ شرم آئے گی، ہاتھی پر سوار نہ ہونا کبر کی وجہ سے نہیں، بلکہ حیا کی وجہ سے ہے، اسی طرح اس کام کے کرنے سے جو مجھے شرم آتی ہے وہ حیا کی وجہ سے ہے، کبر کی وجہ سے نہیں، اب بتلایئے میں اس کو کبر سمجھا تھا، شیخ نے بتلایا کہ یہ کبر نہیں، حیا ہے۔

مرید کا کام:

تو شیخ ایک تو تشخیص کرے گا اور دوسری تجویز کرے گا، یعنی اس کا علاج تجویز کرے گا، اس تشخیص اور تجویز کے بعد اب حضرتؒ فرماتے ہیں کہ تمہارے دو کام رہ جائیں گے، اب وہ بھی میں نے دو لفظ بنادیئے ہیں: اطلاع اور اتباع۔ تم شیخ کو اپنے تمام حالات کی اطلاع دیتے رہو، اور تمہاری اطلاع کے بعد شیخ تشخیص کرے گا، اور تشخیص کے بعد تمہارے لئے تجویز کرے گا اور جو علاج تجویز کرے تو اس کی اتباع کرو، اور اس اتباع کی بھی اطلاع دیتے رہو، پس دو لفظ رہ گئے۔

پیر و مرید کے فرائض:

پورا خلاصہ تصوف کا یہ چار الفاظ بن گئے: اطلاع و اتباع، تشخیص و تجویز۔ دو کام شیخ کے ہیں اور دو کام تمہارے کرنے کے ہیں، شیخ کا کام تشخیص اور تجویز ہے اور مرید کا کام اطلاع و اتباع ہے۔

عورتوں کا فتنہ!

اللہ تعالیٰ کی سنت اور اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اس عالم میں رہتے ہوئے ہر ایک کی ساری ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں ہوتیں، اور دنیا جہاں کی ساری نعمتیں ایک کو نہیں دی جاتیں، حسن و جمال بھی ہو، فضل و کمال بھی ہو اور نوال بھی ہو، علم بھی ہو، عقل بھی ہو، ساری چیزیں ایک ہی گھر میں جمع کردیں، اس دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا۔ ہاں البتہ یہ جنت میں ہوگا، اور جنت میں ایسا ہوگا کہ جو شخص جو چاہے گا کہ میں ایسا ہوجاؤں، وہ ویسا ہی ہوجائے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: ثَلَاث مَنْ فَعَلَهُنَّ فَقَدْ تَعَرَّضَ لِلْمَقْتِ، اَلضِّحْکُ مِنْ غَيْرِ عَجَبٍ، وَالنَّوْمُ مِنْ غَيْرِ سَحَرٍ، وَالْاَكْلُ مِنْ غَيْرِ جَوْعٍ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۳۷)

”عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اُبْتُلِيْتُمْ بِفِتْنَةِ الضَّرَّاءِ فَصَبَرْتُمْ، وَسَتُبْتَلُوْنَ بِفِتْنَةِ السَّرَّاءِ، وَاَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ فِتْنَةَ النِّسَاءِ اِذَا تَسَوَّرْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَبِسْنَ رِيَاطَ الشَّامِ وَعَصْبَ الْيَمَنِ فَاَتْعَبْنَ الْغَنِيَّ وَكَلَّفْنَ الْفَقِيْرَ مَا لَا يَجِدُ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۳۶)

ترجمہ:......”حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: جو شخص تین کام کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن جاتا ہے:

۱:......بغیر تعجب کے ہنسنا۔

۲:......بغیر نیند کے غلبہ کے سوتے رہنا۔

۳:......اور بغیر بھوک کے کھانا کھانا۔“

ترجمہ:......”(دوسری روایت میں) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: تم تکلیف کے امتحان میں ڈالے گئے مگر تم نے صبر کیا، اور اب تم خوشحالی کے امتحان میں ڈالے جاؤگے، اور جس چیز کا تمہارے حق میں سب سے زیادہ اندیشہ کرتا ہوں وہ عورتوں کا فتنہ ہے، جبکہ وہ سونے چاندی کے کنگن پہنیں گی، اور شام کے نرم اور باریک کپڑے پہنیں گی، یمن کے رنگین اور منقش کپڑے پہنیں گی، پس مال دار کو تھکا دیں گی، اور فقیر اور نادار کو ایسی چیز کا مکلّف کریں گی جو اس کو میسر نہیں۔“

غضبِ الٰہی کے موجب تین امور:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پہلے ارشاد میں ہے جو شخص تین چیزوں کا ارتکاب کرے وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نشانہ بن جاتا ہے:

۱:......بغیر تعجب کے ہنسنا۔

۲:......بلاوجہ اور بغیر نیند کے غلبہ کے سوتے رہنا۔

۳:......بغیر بھوک کے کھاتے رہنا۔

ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں، یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دو کہ جس شخص سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، اس کو ان تین چیزوں میں مبتلا فرمادیتے ہیں، یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ تین باتیں اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کا سبب بنتی ہیں۔

فطری امر:

یہ فطری امر ہے کہ غم کی بات پر آدمی کو غم ہوتا ہے، خوشی کی بات پر آدمی خوش ہوتا ہے، رونے کی بات پر روتا ہے، ہنسنے کی بات پر ہنستا بھی ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے انفعالیت رکھی ہے یعنی متأثر ہونا، جیسے حالات اس کے سامنے آئیں، ان سے یہ متأثر ہوتا ہے، غالب کے بقول:

دل ہی تو ہے نہ کہ سنگ و خشت
درد سے بھر نہ آئے کیوں؟

آدمی کا دل اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ یہ متأثر ہوتا ہے، اینٹ پتھر نہیں ہے جو متأثر نہ ہو، اس لئے آدمی کو ہنسنے کی بات پر ہنسی بھی آجاتی ہے۔

ہنسی کے تین درجات:

لیکن ہنسی کے بھی تین درجے ہیں:

ایک ہے تبسم کرنا، جس کو ہم ''مسکراہٹ'' کہتے ہیں۔

اور دوسرا ہے بغیر آواز کے ہنسنا، جس کو عربی میں ''ضحک'' کہتے ہیں، اس میں ہلکی سی آواز بھی آتی ہے، دانت بھی ظاہر ہوجاتے ہیں۔

اور تیسرا ہے قہقہہ لگانا کہ دور تک اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تبسم سنت انبیاؑ ہے:

تبسم تو سنت انبیاؑ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر متبسم رہتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ''ضحک'' بھی ثابت ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ: ہم مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھتے تھے، کبھی جاہلیت کی باتیں شروع ہوجاتی تھیں کہ ہم جاہلیت کے زمانے میں یہ کیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی سماع فرماتے تھے، صحابہ کرامؓ کہتے ہیں کہ

ہنسنے کی بات پر ہنستے بھی تھے، لیکن ساری زندگی میں کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قہقہہ ثابت نہیں۔

قہقہہ غفلت کی علامت:

بلند آواز سے قہقہہ لگانا غفلت کی دلیل ہے یعنی دل کے غافل اور دل کے سخت ہونے کی علامت ہے، اور حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ:

”..... اِنَّ اَبۡعَدَ النَّاسِ مِنَ اللّٰہِ الۡقَلۡبُ الۡقَاسِیۡ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۹۸)

ترجمہ:......”لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور وہ سنگدل آدمی ہے جس کا دل سخت ہو۔“

جو آدمی اللہ سے دور ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگئے، جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، تو اس کو قریب کرلیتے ہیں، اسے اپنی محبت نصیب فرماتے ہیں، اپنی رضا نصیب فرماتے ہیں، اپنی خشیت نصیب فرماتے ہیں، اپنا ادب نصیب فرماتے ہیں، اپنا تعلق نصیب فرماتے ہیں، جتنا زیادہ کسی کو قرب ہوگا، اتنی ہی زیادہ اس پر عنایتیں ہوں گی۔ اور جتنا کوئی دور ہوگا، اتنا ہی نعمتوں سے دور ہوگا۔

آدمی سونے کے لئے نہیں:

آدمی کو دنیا میں سونے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کام کرتے ہوئے اس کے بدن میں تعب پیدا ہوجاتا ہے یعنی تھکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے، اس کے علاج کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں نیند عطا فرمائی ہے، تاکہ اس کے بدن کی خوراک اس کو پوری ملتی رہے۔

انسان کھانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا:

یہی مسئلہ کھانے کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں کھانے کے لئے نہیں بنایا

بلکہ کھانا ہمارے لئے بنایا ہے۔ سونا اور کھانا دونوں ضرورت کی چیزیں ہیں، ان میں اتنی کمی نہ کی جائے کہ بدن میں اختلال پیدا ہو، صحت متأثر ہو، آدمی سوئے نہیں تو چڑچڑا ہو جاتا ہے، بے چارے نفسیاتی مریضوں کو نیند نہیں آیا کرتی، بلاشبہ سونا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور ضرورت کی چیز ہے، لیکن تم کو سونے کے لئے پیدا نہیں کیا۔ کھانا بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کھانے سے ہمارے بدن کی خوراک مہیا ہوتی ہے، اس سے بدن کا قِوام بنتا ہے اور بدن کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے، لیکن کھانا بھی ضرورت کی چیز ہے، خود مقصود نہیں، مقصد کچھ اور ہے۔ گاڑی میں تیل ڈالا جاتا ہے، خود تیل ڈالتے رہنا ہی مقصد نہیں، وہ تو اس کی ضرورت ہے، اس کے بغیر وہ چلتی نہیں۔ تو جس شخص نے کھانے، پینے اور سونے کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہو، حتیٰ کہ فرائض الٰہیہ کی بجا آوری میں بھی سستی ہوتی ہو، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم سوئے رہ جاتے ہیں، اکثر صبح کی نماز قضا ہو جاتی ہے، معلوم ہوا کہ نماز کو مقصد نہیں سمجھا، بلکہ کھانے پینے اور سونے کو مقصد سمجھا۔

نماز مقصد ہے:

میں بچوں کو کہا کرتا ہوں کہ نماز مقاصد میں سے ہے، کھانا، پینا، سونا مقصود نہیں ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کے لئے پیدا کیا ہے، نماز پڑھنا ہماری تخلیق، ہماری پیدائش اور دنیا میں ہمیں بھیجے جانے کے مدعا اور مقصد میں سے ایک ہے۔ نمازی کا بدن ایک سواری ہے اور سواری کے لئے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، چارے کی ضرورت ہوتی ہے، اگر آدمی اس گھوڑے کو پالنے میں ہی لگا رہے، اور اس سے کام نہ لے اور یا کم لے تو وہ بھی عربوں کے محاورے کے مطابق جیسا کہ عربی کہا کرتے ہیں کہ یہ شخص زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ؟ اگر کوئی گدھے کے پالنے میں ہی لگا رہتا ہے اور اس سے کام نہیں لیتا تو اپنے گدھے سے بڑا گدھا یہ خود ہے، اللہ

تعالیٰ ہمیں مقصد کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آزمائش کی قسمیں:

دوسرے ارشاد میں فرماتے ہیں کہ آزمائشیں دو قسم کی ہوتی ہیں، کبھی اللہ تعالیٰ تنگی کے ساتھ آزماتے ہیں، کبھی فراخی کے ساتھ، کبھی بیماری کے ساتھ اور کبھی صحت کے ساتھ، کبھی کمزوری کے ساتھ اور کبھی صحت وقوت کے ساتھ۔ تو تم لوگ تکلیف اور تنگی کے فتنے میں مبتلا کیے گئے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں تنگی دے کر آزمایا۔

صحابہ کرامؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتنی تنگی میں تھے یہ تو سب کو معلوم ہے، بہرحال آپ نے فرمایا اس پر تو تم نے صبر کرلیا یعنی اس آزمائش پر الحمدللہ! پورے اترے اور اس امتحان میں کامیاب رہے، اور اب اللہ تعالیٰ تمہیں فراخی کے ساتھ آزمائیں گے، اس میں کامیاب ہونے والے بہت کم ہیں۔

عورتوں کے ذریعہ آزمائش:

اور خود تو خیر آدمی چل سکے لیکن ان عورتوں کا کیا علاج کرے؟ یہ عورتیں تو لاعلاج بیماری ہیں، فرمایا کہ: ''جس آزمائش کا مجھے سب سے زیادہ اندیشہ ہے، وہ عورتوں کی آزمائش ہے۔'' کہ تم عورتوں کے فتنے کے سامنے نہیں ٹھہر سکو گے، فتنے کا یہ سیلاب تمہیں بہا کر لے جائے گا، جیسا کہ اکبر مرحوم نے کہا ہے:

اکبر نہ دب سکے برٹش کی فوج سے
لیکن شہید ہوگئے بی بی کی نوج سے

اور فرمایا کہ: یہ اس وقت ہوگا جب یہ سونے اور چاندی کے کنگن پہننے لگیں گی، اب تو چاندی بھی گئی، صرف سونا رہ گیا ہے، ''ریاط الشام'' یعنی شام کے مہین نرم و نازک کپڑے پہننے لگیں گی، اُس وقت یہ باریک کپڑے وہاں بنتے ہوں گے، اور یمن کے ''عصب'' یعنی منقش اور پھول دار کپڑے پہننے لگیں گی، اور ان کی فرمائشوں

سے غنی آدمی عاجز آجائے گا۔

عورتوں سے مال دار آدمی کا عاجز ہونا:

اچھا خاصا اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے، لیکن بیگم صاحبہ کی فرمائشیں پوری نہیں کرسکتا، کیا کریں؟ اور فقیر کو اس چیز کا مکلّف کریں گی جو اس کو میسر نہیں، اب فقیر کے پاس کچھ ہے نہیں، بے چارہ نادار آدمی ہے وہ کہاں سے لاکر دے؟ لیکن بیگم صاحبہ کا اصرار ہے کہ میں نہیں جانتی، ہمارا معیارِ زندگی ہمسائی کے برابر ہونا چاہئے۔

عورتوں کی کمزوری:

چند چیزیں عورتوں کی کمزوری ہوتی ہیں، ایک تو قدرتی طور پر ان کو نمائش کی عادت ہوتی ہے، مثلاً: اگرچہ اپنے گھر میں بہت ہی سکھ ہے، آرام ہے، اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ ہے، لیکن اگر آس پڑوس والوں نے دیکھا نہیں، رشتہ داروں نے اس کا معائنہ نہیں کیا، تو پھر اس کا لطف کیا آیا؟ مزے کی بات تو نہ ہوئی، اردگرد کے لوگ آئیں اور ہمارے گھر کے نقارخانے کو دیکھ کر پہلے تو ششدر اور حیرت زدہ رہ جائیں، پھر وہ تعریف کے چند کلمات بول کر جائیں، اور پھر وہاں سے نکلیں تو ہمیں گالیاں نکالیں، عورتیں ایسی عقلمند ہیں کہ جانتی ہیں کہ یہ ہمارے سامنے جھوٹ بول رہا ہے، لیکن اس کی جھوٹی تعریف سے خوش ہورہی ہیں، ایک تو ان کو نمائش کی بیماری ہے۔

اب اللہ تعالیٰ نے کسی کو زیادہ دے رکھا ہے، کسی کو کم دے رکھا ہے، کسی کو اتنا زیادہ دے رکھا ہے کہ اس کے کتوں کا بجٹ ہزاروں روپے ماہانہ کا ہے، میرے مالک کی تقسیم ہے، کسی کو صرف اتنا دیا ہے کہ روٹی ہی ملتی ہے، کسی کو یہ بھی نہیں، جیتا وہ بھی ہے، جیتا یہ بھی ہے، اس کی بھی گزر رہی ہے، اُس کی بھی گزر جائے گی۔

دنیا میں ساری خواہشیں پوری نہ ہوں گی:

اللہ تعالیٰ کی سنت اور اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ اس عالم میں رہتے

ہوئے ہر ایک کی ساری ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہیں ہوتیں، اور دنیا جہاں کی ساری نعمتیں ایک کو نہیں دی جاتیں، حسن و جمال بھی ہو، فضل و کمال بھی ہو اور نوال بھی ہو، علم بھی ہو، عقل بھی ہو، ساری چیزیں ایک ہی گھر میں جمع کر دیں، اس دنیا میں یہ نہیں ہوسکتا۔

جنت میں سب خواہشیں پوری ہوں گی:

ہاں البتہ یہ جنت میں ہوگا، اور جنت میں ایسا ہوگا کہ جو شخص جو چاہے گا کہ میں ایسا ہو جاؤں، وہ ویسا ہی ہو جائے گا۔

ایک حدیث میں لمبا قصہ آتا ہے، اس میں ایک جملہ یہ ہے:

”..... قَالَ: فَيَقْبِلُ الرَّجُلُ ذُوْ الْمَنْزِلَةِ الْمُرْتَفِعَةِ فَيَلْقٰى مَنْ هُوَ دُوْنَهٗ وَمَا فِيهِمْ دَنِيٌّ فَيَرُوْعُهٗ مَا يَرٰى عَلَيْهِ مِنَ اللِّبَاسِ فَمَا يَقْضِىْ آخِرُ حَدِيْثِهٖ حَتّٰى يَتَخَيَّلَ عَلَيْهِ مَا هُوَ اَحْسَنُ مِنْهُ .... الخ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۹۹)

ترجمہ:.....”جنت والوں کا اجتماع ہوگا تو ایک بڑے درجے کا جنتی ہے اور ایک چھوٹے درجے کا جنتی ہے (ظاہر بات ہے کہ درجات تو وہاں بھی ہوں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بڑے درجے کے جنتی کا لباس اس کی شان کے لائق ہوگا، چھوٹے درجے کے جنتی کا لباس اس کے لائق ہوگا، تو اس شخص کے دل میں خیال آئے گا کہ اس کا لباس عمدہ ہے، کسی کی کوئی عمدہ چیز دیکھ کر آدمی کے دل سے ایک خواہش نکلتی ہے اور ایک خواہش دل میں پیدا ہوتی ہے، تو اس کے دل میں خیال آئے گا کہ اس کا لباس اچھا ہے گویا اپنے اندر نقص نظر آئے گا) حالانکہ

کوئی نقص نہیں ہوگا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
دیکھتے ہی دیکھتے اس کا لباس اتنا حسین وجمیل ہوجائے گا کہ یہ
اپنے لباس کواس سے زیادہ حسین سمجھے گا۔‘‘

دنیا میں جنت کے مزے لوٹنے کا گُر:

یہ ایک نکتہ معرفت ہے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں اس دنیا میں یہ چیز نصیب فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے، میں یہ سمجھوں کہ میرے حسب حال جتنا دیا ہے کسی کو بھی اتنا نہیں دیا، تو ہماری یہ دنیا ہی جنت بن جائے گی، پڑا ہوگا کسی کے پاس مال، پڑا ہوگا کسی کے پاس جمال اور پڑی ہوں گی کسی کے پاس فلاں فلاں نعمتیں، ہمیں کیا؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ کا شعر ہے:

مجھ کو کیا کس کے جام میں ہے کیسی مے؟
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ مے خانہ ہے!

کسی کے پیمانے میں کیسی شراب ہے؟ مجھے اس سے کیا؟ پورے مے خانہ کا نچوڑ میری پیالی میں موجود ہے۔ مجھے کیا دیکھنا ہے کہ کسی کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے؟ کس کے ساتھ کیا عنایتیں ہو رہی ہیں؟ میں دوسروں کو کیوں دیکھوں؟ میں تو صرف اپنے کو دیکھوں اور اپنے مالک کو دیکھوں۔

عورتوں کا انداز:

سارے مالک کے بندے ہیں، مالک کس کے ساتھ کیا معاملہ کر رہا ہے؟ وہ جانے اس کا بندہ جانے، میرے ساتھ میرے مالک نے ایسی عنایت کا معاملہ کیا ہے کہ کیا بات ہے؟ اگر ہر آدمی کے دل میں یہ بات پیدا ہوجائے، تو جنت دنیا میں ہی پیدا ہوگئی، خلاصہ یہ کہ یہ سب چیزیں ہر ایک کو نہیں دی جاتیں۔

تو ان عورتوں کا انداز حاکمانہ ہوتا ہے۔

جب برابر والا اپنے برابر والے سے کہتا ہے کہ یہ کرلیجئے! تو یہ ''التماس'' کہلاتا ہے اور اگر بندہ اپنے اللہ تعالیٰ سے یہ کہے کہ یہ میرا کام کردیجئے! یہ ''دعا'' کہلاتی ہے، اس میں اور حاکم کے صیغے میں لفظ ایک ہی ہے، لیکن حاکم کے لفظ میں ایک انداز کا تحکم پایا جاتا ہے، اور برابر والے میں یہ ہی لفظ کہنے میں ایک قسم کی چاہت پائی جاتی ہے، اور چھوٹا جب بڑے سے یا بندہ جب اپنے خدا سے یہی لفظ کہتا ہے کہ یہ کردیجئے تو اس میں عاجزی، انکساری، تواضع، ذلت، مسکنت پائی جاتی ہے، اور یہی دعا کا حاصل ہے۔ ہم اس کو مانگنا کہتے ہیں، دعا کے معنی اللہ سے مانگنا، مانگنا کام ہوتا ہے گداگر کا، فقیر اور محتاج کا، صیغہ ایک ہے لیکن مخاطب کے لحاظ سے اندازِ گفتگو بدل جاتا ہے، عورتوں کی بھی فرمائش ہوتی ہے لیکن ان کا انداز نیازمندانہ کبھی نہیں ہوتا کہ: ''ہمیں یہ کرلینا چاہئے۔'' ملتمسانہ بھی نہیں ہوتا جیسے برابر والا برابر والے سے کہتا ہے، بلکہ ان کا اندازِ گفتگو تحکمانہ ہوتا ہے، اور حاکم کے حکم میں ترمیم کی یا نظرثانی کی گنجائش ہوتی ہے، لیکن ان کے حکم میں نہیں، ان کے ہاں نظرثانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، حاکم سے کہہ دیجئے کہ ذرا دیکھ لیں اس کام کا کرنا ذرا مشکل ہوگا تو وہ کہتا ہے کہ بھائی! اگر نہیں ہوسکتا تو رہنے دو، گویا اس میں ترمیم ہوسکتی ہے، نظرثانی کی گنجائش ہے۔

لیکن گھر کی ملکہ عالیہ کے فرمان میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں اور پھر حاکم کا حکم بھی سیدھے الفاظ میں ہوتا ہے، عورتوں کو سیدھے الفاظ کہنے کی بیماری نہیں ہے، یہ اپنے تحکمانہ انداز میں مزید پیچیدگی پیدا کیا کرتی ہیں، اور اس کے ساتھ طنز، طعن اور تشنیع کا نشتر بھی ساتھ لگاتی ہیں۔ نادار آدمی تو بے چارہ عاجز ہوجائے گا۔

لوگوں کے حالات میرے سامنے آتے رہتے ہیں، لوگ خطوط کے ذریعے اپنے حالات بتاتے رہتے ہیں، میں اپنے حساب سے ان کو مشورہ دیتا رہتا ہوں، جیسے

مجھے الٹے سیدھے آتے ہیں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے جتنا فہم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بہت سارے گھر بس گئے، قریب تھا کہ وہ گھر اجڑ جاتے۔

تو فقیر آدمی جو نادار ہے، وہ ان سے عاجز آجاتا ہے، اور غنی بھی عاجز آجاتا ہے۔ یہ ہے وہ عورتوں کی آزمائش جس کے بارے میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے سب سے زیادہ اندیشہ اس کا ہے۔

کالا خضاب:

بہت سے نوجوان کہتے ہیں اور کل ایک مولوی صاحب بھی تشریف لائے تھے، انہوں نے اپنی ضرورت پیش کی اور ان کی داڑھی پر ''وسمہ'' لگا ہوا تھا، منہ کالا کیا ہوا تھا، میں نے کہا کہ تم منہ کالا کرتے ہو، تمہارے پیچھے تو نماز بھی مکروہ ہے، کہنے لگا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ: میری بیوی کی عمر مجھ سے کافی چھوٹی ہے، میں نے کہا کہ کوئی اور رنگ کرلو، کالا نہ کیا کرو۔ بھلا اوپر کالے رنگ کا خول چڑھا کر آدمی جوان ہوجائے گا؟ کیا اس کی بیوی نہیں جانتی بے وقوف! اندر سے سفید بال تو نظر آرہے ہیں، بہت سارے لوگوں کو میں نے اس حماقت میں مبتلا دیکھا، بیوی کی وجہ سے بہت سارے لوگ داڑھی منڈوانے کی حماقت میں مبتلا ہیں، اور یہ ٹی وی اور یہ ساری چیزیں کس لئے چل رہی ہیں؟ یہ سب عورتوں کا کیا دھرا ہے۔

خواتین کی نیکی کا اثر:

میں نے شاید یہ قصہ سنایا تھا کہ: ایک مہاجر خاندان مکہ مکرمہ گیا تھا، پرانے زمانے میں لوگ ہجرت کرکے چلے جایا کرتے تھے، اللہ کے بندے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جاکر ٹک جاتے تھے، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو نوازا بھی، لیکن اس وقت ان کا کوئی سامان نہیں ہوتا تھا، تو ایک مہاجر خاندان جو بہت ہی دیندار تھا، بچے بڑے ہوگئے تو بچے کہنے لگے کہ: ٹی وی لائیں، گھر

کی اسمبلی میں اس پر بحث ہوئی، بہرحال قرارداد یہ منظور ہوئی کہ امام کعبہ سے پوچھ لیا جائے، اگر وہ اجازت دیں تو لے آؤ۔ ابا جان اور ان کے لڑکے امام کعبہ کی خدمت میں گئے، تو امام کعبہ نے فرمایا کہ: تمہارے ہاں ابھی تک ٹی وی نہیں ہے؟ میرے ہاں تو دو ہیں!:

چوں کفر از کعبہ برخیزد
کجا ماند مسلمانی؟

ٹی وی کا وبال:

اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا، اب کیا تھا ابا اور بیٹا ٹی وی خرید کر کے گھر لے آئے، وہ خاتون خانہ بہت نیک تھی، رات میں ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ”تم لوگوں نے بھی یہ لعنت اپنے گھر میں ڈال لی؟ تم تو اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف ہجرت کرکے آئے تھے!“ صبح ہوئی فجر کی نماز کے بعد اس خاتون نے اپنے شوہر کو اور اپنے لڑکوں کو بٹھایا، بٹھا کر اپنا خواب بتایا اور کہنے لگی کہ: میں تم لوگوں کو تو مجبور نہیں کرسکتی، لیکن تم بھی مجھے مجبور نہ کرو، مجھے کوئی کمرہ کسی جگہ کرایہ پر لے کر دے دو یا تو ٹی وی گھر میں رہے گا یا میں گھر میں رہوں گی، دونوں میں سے ایک رہے گا، وہ لڑکے ابھی تک اس نوبت کو نہیں پہنچے تھے کہ ماں کو گھر سے نکال دیں اور ٹی وی کو رکھ لیں، ابھی تک ان کی ماہیت اتنی مسخ نہیں ہوئی تھی، انہوں نے فوراً گھر سے ٹی وی نکال دیا۔

اگر خواتین نیک ہوں تو.....:

اگر ان ہماری عورتوں کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمادیں، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوجائے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمائیں کہ: میری امتی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟ مگر یہ دولت ہر ایک کو تو نصیب نہیں ہوتی ناں! یہ تو

قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے، اگر گھر کی خواتین نیک ہوں، اور یہ کہیں کہ: ہم بھوکی تو مرسکتی ہیں، مگر ہمیں غیر شرعی چیزوں کی ضرورت نہیں، اور ناپاک آمدنی گھر میں نہیں آنے دیں گی، تو تمہارے گھروں کا نقشہ کچھ اور ہو، یہ جتنی نمائشیں ہو رہی ہیں، یہ جتنے ہال سج رہے ہیں، یہ جتنے بھڑکیلے کپڑے پہنائے جارہے ہیں، اور جس طرح عورتیں آزادانہ باہر پھر رہی ہیں، یہ ساری کی ساری عورتوں کی بدعقلی اور بے عقلی کے کرشمے ہیں۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے حاکم بنایا، لیکن وہ بے چارے عورتوں کے محکوم ہی نہیں، بلکہ ان کے غلام ہیں، غلام کے بجائے قیدی ہیں، کبھی ان کے دام سے چھوٹ ہی نہیں سکتے۔

عورت کے تین ہتھیار:

ایک دانا کا قول ہے کہ: عورت یا تو طعنہ دے کر منوالیتی ہے یا مسکرا کر منوالیتی ہے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو رو کر منوالیتی ہے۔ یہ تین ہتھیار اپنی بات منوانے کے لئے عورت کے پاس ہیں، اور آدمی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

سب سے خوفناک فتنہ:

یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ: ''سب سے زیادہ خوف ناک فتنہ جس کا مجھے تمہارے حق میں اندیشہ ہے وہ عورتوں کا فتنہ ہے۔'' اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی ترجمانی ہے، مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

''مَا تَرَكْتُ بَعْدِىْ فِتْنَةً اَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ۔'' (مشکوٰۃ ص:۲۶۷)

ترجمہ:...... ''میں نے اپنے بعد کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے حق میں عورتوں سے زیادہ نقصان دہ ہو۔''

سب سے زیادہ ضرر رساں، سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا فتنہ،

عورتوں کا فتنہ ہے، فتنہ سے مراد عورتوں کی آزمائش ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔“ (الطلاق:۱۵)

ترجمہ:...... ”تمہارا مال اور تمہاری اولاد فتنہ ہے۔“

اولاد کی ماں سب سے پہلا فتنہ ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کا نام ذکر نہیں کیا، گزشتہ آیت میں ذکر کردیا:

”يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ۔“ (الطلاق:۱۴)

ترجمہ:...... ”تمہاری بیویوں میں سے اور تمہاری اولاد میں سے بعض ایسے ہیں جو حقیقت میں تمہارے دشمن ہیں، ان سے بچتے رہا کرو۔“

اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم فرمایا تھا، بچ کے رہنے کا حکم فرمایا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سب سے زیادہ ضرر رساں، نقصان دینے والا فتنہ فرمایا تھا، اور آج پوری کی پوری امت اس میں مبتلا ہوگئی ہے۔

آج نہیں تو کل سمجھ آجائے گی:

اور آج اگر کوئی اس کے خلاف بولے تو بولنے والا دقیانوسی ہے، مُلَّا ہے، یہ پرانے زمانے میں رہتا ہے، تاریک زمانے میں رہتا ہے، تاریک ذہن والا ہے، تمہارے دل میں جو کچھ آئے، ہمیں کہہ لو، جو کچھ زبان پر آئے، ہمیں کہہ لو، لغت میں تمہیں جو الفاظ مل سکتے ہیں وہ استعمال کرلو، مولوی کو جتنا برا بھلا کہہ سکتے ہو، جتنی گالیاں دے سکتے ہو، شوق سے دو، لیکن میں آج بھی کہتا ہوں، کل بھی کہوں گا کہ مولوی جو کچھ بھی کہتا ہے، تمہاری خیرخواہی کے لئے کہتا ہے، اپنی ذات کے لئے نہیں کہتا، آج اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو کل مرنے کے بعد تمہیں یقین آجائے گا کہ مولوی

اگر ہم پر کوئی تنقید کرتا تھا یا ہمارے عیوب کی نشاندہی کرتا تھا تو ہمارے ہی فائدہ کے لئے اور ہماری ہی خیرخواہی کے لئے کرتا تھا، اس کی اپنی کوئی ذاتی غرض نہیں تھی، تم بتاؤ ناں! اس میں میری کیا ذاتی غرض ہے؟

پھر بھی گھروں میں خوشگواری نہیں:

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تمام فرمائشیں اپنی بیویوں کی پوری کرتے ہو، لیکن تمہارے گھر میں خوشگواری نہیں ہے، میاں بیوی کے تعلقات پھر بھی خوشگوار نہیں ہیں، میں جانتا ہوں، میں ناواقف نہیں ہوں، واقف ہوں، سو گھروں میں سے ایک گھر ایسا ہوگا جہاں میاں بیوی کے درمیان میں کامل و مکمل یکجہتی پائی جاتی ہوگی، بیوی صاحبہ کو ذرا چھیڑ کر دیکھ لیجئے کیسے قصیدے سناتی ہیں اپنے میاں کے، اور میاں صاحب سے پوچھ کر دیکھ لیجئے وہ بھی ایک دفتر کھول کے بیٹھ جائیں گے، تو مقصد یہ ہے کہ خوشگواری یہ نہیں، خوشگواری یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کی دولت عطا فرمادی، دین کی دولت عطا فرمادی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق پیدا فرمادیا، حضورؐ کی امت میں داخل کردیا، اب تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر عمل کر چلو۔

رشتہ ازدواج کا مقصد:

"رشتہ ازدواج" میاں بیوی کا رشتہ اس واسطے ہے تاکہ وہ دین پر چلنے کے لئے ایک دوسرے کے مددگار بنیں، نہ اس لئے کہ ایک دوسرے کو پکڑ کر جہنم میں لے جائیں، نکاح اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اگر ایک نہیں جانا چاہتا تو دوسرا اس کو پکڑ کر، گھسیٹ کر جہنم میں لے جائے، نہیں بھائی! اگر ایک نہ چل سکتا ہو تو دوسرا اس کو گھسیٹ کر، اٹھا کر جنت میں لے جائے، جنت والے اعمال میں، اللہ تعالیٰ کی رضامندی والے اعمال میں ایک دوسرے کی مدد کرو، تو پھر میرا اللہ تمہارے دلوں میں جوڑ پیدا کردے گا۔ تمہارے گھر میں کچھ نہیں ہوگا اس کے باوجود تمہارا گھر جنت کا

نمونہ ہوگا، تم دوسروں کو کیوں دیکھتے ہو؟

انعاماتِ الٰہیہ:

تمہیں اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں، کتنی بڑی نعمت ہیں، ہاتھ پاؤں دیئے ہیں، زبان دی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اچھی شکل وصورت عطا فرمائی ہے، کتنے انعاماتِ الٰہیہ ہیں اور تمہیں کھانے کے لئے روٹی بھی دے دیتا ہے، بس اتنا ہی ہے ناں! کہ جینا ہے، تم شکایات کے دفتر کھول بیٹھتے ہو، ہمارے پاس یہ نہیں، ہمارے پاس وہ نہیں، کبھی کلمہ شکر بھی تمہاری زبان سے نکلا ہے؟ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا بھی ہوگا، کیا بڑے، کیا چھوٹے، کیا مرد، کیا عورتیں، سب کے سب گھر میں شکر کرنے والے ہوں، تو آسمان سے اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور رحمتیں نازل ہوں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی چیز کی کمی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مانگ لو، لیکن مانگنا حاکمانہ انداز میں نہیں ہونا چاہئے، پھر اس پر بھی راضی ہوجاؤ کہ دے دیں تو عنایت ہے، نہیں دیں گے تو یہ بھی عنایت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بدعت کی حقیقت

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بدعت کی ایجاد کرے، اس کی سب سے پہلی نحوست یہ ہے کہ اس سے سنت چھوٹ جاتی ہے، جب یہ لوگ کوئی نئی بات گھڑتے ہیں تو الٹا کہتے ہیں کہ جی اس میں کیا حرج ہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

’’وَاِنَّ اَنْصَحَكُمْ لِنَفْسِهٖ اَطْوَعُكُمْ لِرَبِّهٖ، وَاِنَّ اَغَشَّكُمْ لِنَفْسِهٖ اَعْصَاكُمْ لِرَبِّهٖ، مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ يَأْمَنْ وَيَسْتَبْشِرُ، وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ يَخَفْ وَيَنْدَمُ، ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ الْيَقِيْنَ وَارْغَبُوْا اِلَيْهِ فِى الْعَافِيَةِ، وَخَيْرُ مَا دَامَ فِى الْقَلْبِ اَلْيَقِيْنُ، اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُهَا، وَاِنَّ مُحْدَثَاتِهَا شَرَارُهَا، وَكُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ، وَكُلُّ مُحْدِثٍ مُبْتَدِعٌ، وَمَنِ ابْتَدَعَ فَقَدْ ضَيَّعَ، وَمَا اَحْدَثَ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ اِلَّا تَرَكَ بِهَا سُنَّةٌ، اَلْمَغْبُوْنُ مَنْ غَبِنَ دِيْنَهٗ وَالْمَغْبُوْنُ مَنْ خَسِرَ نَفْسَهٗ، وَاِنَّ الرِّيَاءَ مِنَ الشِّرْكِ، وَاِنَّ الْاِخْلَاصَ مِنَ الْعَمَلِ وَالْاِيْمَانِ، وَمَجَالِسُ اللَّهْوِ تُنْسِى الْقُرْآنَ، وَيَحْضُرُهَا الشَّيْطَانُ، وَتَدْعُوْ اِلٰى كُلِّ غَيٍّ، وَمُجَالَسَةُ النِّسَاءِ تُزِيْغُ الْقُلُوْبَ وَتُطْمِحُ اِلَيْهِ الْاَبْصَارُ وَهِىَ مَصَائِدُ

الشَّيْطَانِ، فَاصْدُقُوا اللهَ: فَإِنَّ اللهَ مَعَ مَنْ صَدَقَ، وَجَانِبُوا الْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ مُجَانِبٌ لِّلْإِيْمَانِ، اَلَا! اِنَّ الصِّدْقَ عَلٰى شَرَفٍ مُنْجَاةٍ وَكَرَامَةٍ .....الخ۔“

(البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......”اور بے شک تم میں سب سے زیادہ اپنے نفس کا خیرخواہ وہ ہے جو سب سے زیادہ اپنے رب کا فرمانبردار ہو، اور بے شک تم میں سے سب سے زیادہ اپنے نفس کے ساتھ دھوکا کرنے والا وہ ہے جو اپنے رب کی سب سے زیادہ نافرمانی کرنے والا ہو، جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے وہ امن میں رہے گا، اور اس کو خوشی نصیب ہوگی، اور جو اللہ کی نافرمانی کرے وہ خوف اور اندیشہ میں رہے گا، اور اس کو ندامت حاصل ہوگی، پھر اللہ سے یقین مانگا کرو اور اس کی طرف رغبت کرو عافیت میں، اور سب سے بہتر وہ چیز جو قلب میں ہمیشہ رہے، یقین ہے، اور جو امور کہ پختہ ہوں وہ سب سے افضل ہیں، اور بے شک جو کام نئے نئے ایجاد کئے جائیں وہ سب سے بدتر ہیں، ہر نئی ایجاد کی ہوئی چیز بدعت ہے، اور ہر نئی چیز ایجاد کرنے والا مبتدع اور بدعتی ہے، اور جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی اس نے اپنے دین کو ضائع کردیا، اور جس شخص نے کوئی بدعت ایجاد کی اس کی نحوست سے اس نے سنت کو ترک کردیا، خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے دین کو ہار دیا ہو، اور خسارہ میں وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس سے خسارہ پایا ہو، بے شک ریا شرک ہے، شرک کا ایک حصہ ہے، اور بے شک اخلاص عمل و ایمان

میں سے ہے، لہو ولعب کی مجلسیں قرآن کو بھلادیتی ہیں، اور شیطان ان میں حاضر ہوتا ہے، اور وہ ہر گمراہی کی طرف داعی ہوتی ہیں، عورتوں کے ساتھ ہم نشینی دلوں کو ٹیڑھا کردیتی ہے، نظریں ان کی طرف اٹھتی ہیں، اور یہ شیطان کا جال ہیں، پس اللہ تعالیٰ سے سچائی کا معاملہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ ہے جو سچ بولے، اور جھوٹ سے کنارہ کش رہے، کیونکہ جھوٹ ایمان کے منافی ہے، سن رکھو کہ سچائی نجات اور عزت کے کنارے پر ہے، اور جھوٹ ہلاکت و پھسلنے کے کنارے پر۔“

اپنے نفس کا خیرخواہ؟:

یہ امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبہ کے چند فقرے ہیں کہ:

”تم میں اپنے نفس کا سب سے بڑا خیرخواہ وہ ہے جو اپنے رب کا زیادہ فرمانبردار ہو، اور تم میں اپنے نفس کے ساتھ سب سے بڑا دھوکا کرنے والا وہ شخص ہے جو اپنے رب کا بڑا نافرمان ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کرنا اور اس کے حکم کو بجالانا، اپنے نفس کی خیرخواہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور اس کے حکموں کے خلاف کرنا، اپنے نفس کے ساتھ غداری، بے وفائی اور دھوکا دہی ہے، عام لوگ نفس کی خواہش و لذتوں میں اپنے نفس کی خیرخواہی سمجھتے ہیں۔

اور جو شخص کہ نفس کو اس کی لذتوں سے روکنے والا ہو، اور محنت و مشقت اور مجاہدے میں اس کو ڈالنے والا ہو، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص اپنے نفس کا بدخواہ ہے۔

لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے، نفس کی خواہش کو پورا نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضیوں کو پورا کرو، یہ نفس کی خیرخواہی ہے، اور اگر اللہ کی رضا کے خلاف نفس کی خواہش کو پورا کروگے تو اس کو بگاڑ دوگے اور یہ نفس کی بدخواہی ہے۔

اللہ کی فرمانبرداری پر دو بشارتیں:

جوشخص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے اس کو دو دولتیں نصیب ہوں گی: ایک امن، دوسرا بشارت۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی پکڑ سے بے خوف کردیں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”اَ لَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔“ (التوبہ:۶۲)

ترجمہ:......”سن رکھو! کہ اللہ کے دوستوں پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

کوئی مکروہ چیز پیش آنے والی ہو تو اس سے آدمی کو خوف ہوتا ہے، کوئی ناگوار چیز پیش آنے والی ہو تو خوف ہوتا ہے، اور کوئی نامناسب خبر سننے کو ملے تو اس سے آدمی کو غم ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے دوست ہیں، ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ولی کی تعریف:

اولیأاللہ کون ہیں؟ اللہ کا ولی! تم سب اللہ کے ولی ہو بشرطیکہ اس کا کہا مانو، اللہ تعالیٰ کی مان کر چلو تو تم بھی اللہ کے ولی ہو، یوں کہتے ہیں کہ یہ جو ولایت ہے (ولی کہتے ہیں ولایت والے کو) اس کی دو قسمیں ہیں:

۱:......ایک ولایت عامہ ہے۔ ۲:......اور ایک ولایت خاصہ ہے۔

ولایتِ عامہ:

ولایت عامہ تو تمام اہل ایمان کو حاصل ہے، جس نے بھی ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کہا، دل و جان سے اور زبان سے اقرار کرلیا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو قبول کرلیا وہ مؤمن ہے، اور ہر مؤمن اللہ کا ولی ہے۔

ولایتِ خاصہ اور اس کے اجزأ:

اور ایک ولایت خاصہ ہے، اس کے اجزا بہت سے ہیں، لیکن تین چیزیں ان میں سب سے زیادہ اہم ہیں:

۱:......اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا، نافرمانی نہ کرنا۔ اللہ کا حکم ماننا اور اس کے حکم کے خلاف نہ کرنا۔

۲:......کثرت سے ذکر کرنا، اٹھتے، بیٹھتے، جاگتے، سوتے، لیٹتے اللہ کو یاد کرنا، ذکرِ الٰہی سے غافل نہ ہونا۔

۳:......دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ یہ تین نعمتیں عطا فرمادیں وہ ولی ہے۔

اور اس کے مراتب و درجات بے شمار ہیں، کبھی ختم ہی نہیں ہوتے، جو اللہ تعالیٰ کی مان کر چلے وہ اللہ کا ولی ہے، اور اولیأ کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ: ''لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ۔'' نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس لئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والوں کو دو انعام ملیں گے۔

ولی کے لئے پہلا انعام:

پہلا انعام: امن کا حاصل ہونا، قیامت کی ہولنا کیوں سے اللہ پاک ان کو امن عطا فرمائے گا، قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

”اِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡھِمُ الۡمَلٰٓـئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحۡزَنُوا وَاَبۡشِرُوا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ۔ نَحۡنُ اَوۡلِیَاءُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ۔“ (حٰمٓ السجدۃ:۳۰،۳۱)

ترجمہ:......”بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر اس پر قائم رہے (پوری زندگی اسی پر گزار دی اللہ کو رب مان کر)، تو ملائکہ ان کا استقبال کریں گے (اور استقبال کر کے ان سے کہیں گے کہ) نہ تم کوئی اندیشہ کرو اور نہ ہی غم کرو، اور خوشخبری حاصل کرو (یعنی تمہیں بشارت ہو) جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہم تمہارے رفیق و دوست رہیں گے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔“

یہ بشارت کب ملتی ہے؟ فرشتے کب استقبال کرتے ہیں؟ بعض اکابر نے کہا کہ موت کے وقت، اور بعض نے کہا کہ قبروں سے اٹھنے کے وقت۔ دونوں باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ اللہ کی فرمانبرداری کرو گے تو ایک تو امن نصیب ہوگا۔

دوسرا انعام:

دوسری بشارت نصیب ہوگی، چونکہ آدمی سفر آخرت پر اکیلا جاتا ہے، اگر اس وقت ملائکہ کی رفاقت حاصل ہوجائے کہ آؤ ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں، ہمیں سارے راستے معلوم ہیں تمہیں بتلاتے جائیں گے، تو پھر کیا پریشانی؟

نافرمان کے لئے دو سزائیں:

اور جو شخص کہ اللہ کی نافرمانی کرے اسے دو سزائیں ملتی ہیں، آخرت میں جو سزا ملے گی وہ تو ملے گی، مگر نقد دو سزائیں ملتی ہیں:

۱:......خوف۔ ۲:......ندامت۔

مرتے وقت بھی خوف ہوگا اور نزع کی حالت میں بھی خوف ہوگا، جب عالم آخرت کھل جاتا ہے اور غیب کا پردہ ہٹا دیا جاتا ہے اس وقت اس شخص پر خوف طاری ہوگا، اور ندامت ہوگی، کسی نے کوئی گندا کام کیا ہو، تو اس کو ہمیشہ اندیشہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو پتہ نہ چل جائے۔ اور ایک ندامت ہوتی ہے کہ میں نے بہت برا کیا، ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا، بڑا غلط کیا، شرمندگی اور اس شرمساری کی وجہ سے نظر کو اوپر نہیں اٹھا کر دیکھ سکے گا۔

تو معلوم ہوا کہ اپنے نفس کی سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگانا ہے، اور اپنے نفس کی سب سے بڑی بدخواہی اس کو گناہوں کے لئے آزاد چھوڑ دینا ہے۔

ماحول اور عزیز و اقارب کی نہیں، اللہ کی مانو!

میں بار بار کہتا ہوں کہ اپنی زندگی کا نقشہ بنانے کے لئے تم اردگرد کو دیکھتے ہو کہ ماحول خراب ہے، ہمسائے کیا کر رہے ہیں؟ عزیز و اقارب کیا کر رہے ہیں؟ دوست و احباب کیا کر رہے ہیں؟ میں بھی وہی کروں! لیکن اگر تمہارے ہمسائے، تمہارے عزیز و اقارب، تمہارے دوست و احباب، تمہارے بیوی بچے جہنم کے راستہ پر چل رہے ہوں، تو ان کے پیچھے پیچھے جاکر جہنم میں چھلانگ لگانا عقلمندی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی مان کر چلو کہ وہ ہمیشہ کا ساتھی ہے، اور دوسروں کی مان کے نہ چلو کہ تمہیں دھوکا دے دیں گے اور راستہ میں چھوڑ جائیں گے۔

یقین سب سے بڑی دولت ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ سے یقین مانگا کرو، سب سے بڑی دولت یقین ہے۔

اور حدیث میں فرمایا کہ: "اَلْیَقِیْنُ اَلْاِیْمَانُ کُلُّهٗ۔" (بخاری ج:۱ ص:۶) یعنی یقین سارے کا سارا مکمل ایمان ہے۔ یوں کہو کہ ایمان یقین ہی کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں پر اور غیب کے وہ نقشے جو ہمارے سامنے آنے والے ہیں، ان پر جتنا یقین بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی ایمان قوی ہوتا جائے گا، اور جتنا یقین گھٹتا جائے گا، اتنا ہی ایمان بیمار و کمزور ہوتا چلا جائے گا، اللہ سے یقین مانگا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل دعا میں سے ایک ٹکڑا یہ ہے کہ:

"وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا۔"
(سنن ترمذی ج:۲ ص:۱۸۸)

ترجمہ:...... "یا اللہ اتنا یقین نصیب فرمادے جس کی برکت سے دنیا کی ساری مصیبتیں ہلکی پھلکی نظر آئیں۔"

آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی مصیبت ہلکی ہے:

کچھ نہیں ہوا بھائی! اتنا یقین ہوجائے کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی آخرت کے اجر و ثواب کے مقابلے میں جب تمہیں ہلکی پھلکی نظر آئے، اور قبر و حشر کی ہولناکیوں کے مقابلہ میں ہلکی پھلکی نظر آئے، اور فقہ کا قاعدہ ہے: "من ابتلی ببلیتین فلیتخذ اھونھا۔" (جو شخص دو مصیبتوں میں سے کسی ایک مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو اس کو چاہیئے کہ جو زیادہ ہلکی ہو اس کو اختیار کرے)۔

لہٰذا ہمیں یقین ہوجائے کہ آخرت کی مصیبتوں کے مقابلے میں دنیا کی مصیبتیں بہت ہلکی پھلکی ہیں، اور ہم دنیا کی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اپنی آخرت کو برباد نہ کریں، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ آخرت کی قیمت پر دنیا حاصل نہ کریں۔

اللہ سے عافیت مانگو!

دوسری عافیت مانگو اللہ تعالیٰ سے، اللہ کی بارگاہ میں عافیت کی التجا کرو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ۔ اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِیْ۔“

(ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۶)

ترجمہ:......”اے اللہ میں عافیت کی درخواست کرتا ہوں اپنی دنیا میں بھی، اور اپنی آخرت کے معاملہ میں بھی۔ یا اللہ! میں آپ سے عفو و عافیت مانگتا ہوں اپنے دین میں بھی، اور اپنی دنیا میں بھی، اور اپنے اہل میں بھی، اور اپنے مال میں بھی۔ یا اللہ! ڈھانپ دے میرے عیوب کو، اور مجھ کو امن دے میری ان چیزوں سے جو ڈرانے والی ہوں۔“

عافیت کا معنی:

عافیت بہت بڑی چیز ہے، عافیت کے کیا معنی ہیں؟ عافیت کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مکروہات سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ تو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگا کرو، بس یہ دو چیزیں مل گئیں، ایک یقین اور دوسری عافیت، یوں سمجھو کہ دنیا و آخرت کی دولت تمہیں مل گئی، بڑے سیٹھ ہوگئے، تم بڑے غنی ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے یقین و عافیت کی دولت عطا فرمادی۔ اور جس شخص سے اللہ تعالیٰ نے عافیت سلب کرلی (نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!) اس سے زیادہ وبال میں کوئی شخص نہیں، اور جس شخص کو یقین سے محروم کردیا گیا، اس سے بڑا بدبخت کوئی نہیں۔

سب سے بہتر چیز:

فرماتے ہیں: سب سے بہتر چیز جو دل میں رہے وہ یقین ہے۔

اور چیزیں تو آتی جاتی رہتی ہیں، حتیٰ کہ انسان کے اعمال میں بھی کبھی زیادہ توفیق ہوجاتی ہے، اور کبھی کم، کبھی اعمال زیادہ کرلیتا ہے اور کبھی کم کرلیتا ہے، دنیا کی دولتیں بھی کبھی کم حاصل ہوتی ہیں، اور کبھی زیادہ حاصل ہوجاتی ہیں، بس ایک چیز باقی رہے اور وہ یقین کی دولت ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کا ارشاد ہے کہ: باقی رہنے والی تو صرف دو ہی چیزیں ہیں: ایک ایمان اور دوسری عقل۔ اللہ تعالیٰ آخر وقت تک عقل صحیح سالم رکھے، اور دوسری چیز اللہ تعالیٰ مرتے دم تک ایمان پر قائم رکھے، باقی کوئی چیز آئی اور کوئی نہیں آئی، کچھ مل گیا اور کچھ نہیں ملا:

روزہ اگر رفت گرہ باگ نیست
تو کماں کہ انکہ تو پاک نیست

ہم کہا کرتے ہیں کہ کوئی دن تھے، ایسا تھا، ایسا تھا، وہ دن چلے گئے، جانے دو، اس کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ دل کا یقین الحمدللہ! نہ سفر میں جائے اور نہ بیماری وصحت میں جائے، حتیٰ کہ نہ زندگانی میں جائے اور نہ موت میں جائے، مرنے کے بعد تو اور بھی بڑھ جائے گا، اللہ تعالیٰ ہمیں یقین دائمی نصیب فرمائے، آمین!

دوام واستقلال کی اہمیت:

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: سب سے افضل کام وہ ہیں جن کو پابندی کے ساتھ اور عزم کے ساتھ کیا جائے۔

شب برأت کو یا شب قدر کو ساری رات لوگ ٹکریں مارتے رہتے ہیں، اور دوسرے وقت میں نماز کی بھی توفیق نہیں ہوتی، بھائی! تھوڑا کرو لیکن لگ کے کرو، جسے

رہو، پختگی کے ساتھ، دوام کے ساتھ اس طرح عمل کیا جائے کہ وہ چھٹے نہیں، ہاں کوئی عارضہ پیش آجائے تو دوسری بات ہے، جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ بیماری اور سفر اس سے مستثنیٰ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"قَالَ اِذَا ابْتُلِیَ الْمُسْلِمُ بِبَلَاءٍ فِیْ جَسَدِہٖ، قِیْلَ لِلْمَلَکِ اُکْتُبْ لَہٗ صَالِحَ عَمَلِہِ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُ ....الخ۔" (مشکوۃ ص:۱۳۶)

ترجمہ:......"جب بندہ کسی عمل کا پابند ہو، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ عمل نہ کرسکے (یا سفر کی وجہ سے معمولات چھوٹ جائیں)، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے لئے وہی لکھ دو جو کہ صحت اور گھر میں موجود ہونے کی حالت میں کیا کرتا تھا۔"

گویا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو اپنے معمولات کا پکا تھا، لیکن اب بیماری اس کو کام نہیں کرنے دے رہی۔ اور یہ عمل سے عاجز ہے مگر ہم تو اجر دینے سے عاجز نہیں، یہ بیچارا عمل نہیں کرسکتا، مگر ہم تو اجر دے سکتے ہیں، لہٰذا اس کو پورا اجر دے دو۔ تو کبھی کرلینا اور کبھی نہ کرنا، اس سے کام نہیں چلے گا، کرو اور جم کر کرو، اور ایسے جم کر لگاتار کرو کہ وہ تم سے چھوٹ نہ سکے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی معمولات پر پابندی:

الف:......امیرالمؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سنی ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کوئی مسلمان سورۃ البقرہ کی آخری آیتیں پڑھے بغیر بھی سوسکتا ہے۔ آخری رکوع اور خصوصاً "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ" سے

اس کو پڑھے بغیر بھی مسلمان سوسکتا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا ہوں۔

ب:……اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا خاتونِ جنت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسبیحات بتائیں تھیں، سبحان اللہ، الحمدللہ، اللہ اکبر۔ اس کا قصہ یہ ہوا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو دیکھا کہ بندے بہت بیٹھے ہیں، تو واپس چلی گئیں، دوسرے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے گھر تشریف لائے، ارشاد فرمایا: فاطمہ! تم آئیں تھیں، کیا کوئی کام تھا؟ انہوں نے شرم کے مارے سر جھکالیا، نہیں بولیں۔ حضرت علیؓ فرمانے لگے کہ: یا رسول اللہ! میں نے ان کو بھیجا تھا، کیونکہ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں پر گٹھے پڑ گئے ہیں، اور گھر میں جھاڑو دیتی ہیں جس سے کپڑے میلے کچیلے ہوجاتے ہیں، میں نے ان سے کہا تھا کہ تمہارے ابا کے پاس بہت سے غلام اور باندیاں آئی ہوئی ہیں، جاؤ تم بھی ایک خادمہ لے آؤ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

”اَلَا اَدُلُّکُمَا عَلٰی خَیرٍ مِّمَّا سَاَلْتُمَا؟ اِذَا اَخَذْتُمَا مَضَاجِعَکُمَا فَسَبِّحَا ثَلٰثًا وَّثَلٰثِیْنَ، وَاحْمِدَا ثَلٰثًا وَثَلٰثِیْنَ، وَکَبِّرَا اَرْبَعًا وَّثَلٰثِیْنَ، فَھُوَ خَیرٌ لَّکُمَا مِنْ خَادِمٍ۔“

(ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۴)

ترجمہ:……”کیا میں تمہیں اس سے اچھی چیز پر دلالت نہ کروں؟ جب تم سونے لگو تو ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، اور ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہہ لیا کرو، یہ پورا سو ہوجائے گا، یہ تمہارے لئے خادمہ سے زیادہ بہتر ہے۔“

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ:

”فَمَا تَرَکْتُھُنَّ مُنْذُ سَمِعْتُھُنَّ مِنْ رَّسُوْلِ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلَّا لَیْلَةَ الصِّفِّیْنَ فَاِنِّیْ ذَکَرْتُھَا مِنْ آخِرِ

اللَّیْلِ فَقُلْتُھَا۔" (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۳۴)

ترجمہ:......"جس دن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ بتایا، اس دن سے کبھی قضا نہ ہوئی، صرف صفین کی رات پڑھنے میں تاخیر ہوئی کہ رات کے آخری حصہ میں مجھے یاد آئیں۔"

معمول ہوتو ایسا ہو، شاگرد نے پوچھا کہ: "وَلَا لیلة الصفین؟" صفین کی رات میں بھی قضا نہ ہوئی؟ کچھ ڈانٹ کر (کوئی اور لفظ بھی فرمایا) اور فرمایا کہ: "وَلَا لیلة الصفین!" صفین کی رات بھی قضا نہیں ہوئی۔ یعنی کیسی ہی پریشانی کا عالم کیوں ہو اور کیسی ہی مصروفیت کیوں ہو یہ نہیں چھوٹی۔

دراصل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر پکا رنگ چڑھا تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔"

(البقرۃ:۱۳۸)

(یہ اللہ کا رنگ ہے، اور رنگنے میں اللہ سے بہتر کون ہوسکتا ہے؟) صحبت نبوی ﷺ کی وجہ سے اللہ کا رنگ چڑھ جاتا تھا ان پر، اور رنگ بھی پکا جو پھر اترتا بھی نہیں تھا۔ تو ارشاد فرماتے ہیں: "اِنَّ عَوَازِمَ الْاُمُوْرِ اَفْضَلُھَا۔" سب سے پختہ اعمال وہ ہیں جو کہ پابندی اور پختگی کے ساتھ کئے جائیں، اور سب سے بدتر کام وہ ہیں جو "محدثاتھا" نئے ایجاد کئے جائیں۔

کیا دین ناقص تھا؟

کچھ لوگوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نامکمل سمجھ کر اپنی طرف سے اس میں اضافہ شروع کردیا، عبادت کے نئے نئے طریقے ایجاد

کئے ہیں، یہ ختم شریف اور گیارہویں شریف تو چلتے ہی تھے، اب جلوس بھی شروع ہوگئے ہیں، عرس شریف، جلوس شریف، میلہ شریف، نامعلوم کیا کیا شریف؟ غالباً یہ نئی نئی بدعتیں ایجاد کرنے والے سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین مکمل نہیں تھا، اب یہ اس کی تکمیل کرنے چلے ہیں۔ نعوذ باللہ!

بدعت کی نحوست:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص بدعت کی ایجاد کرے، اس کی سب سے پہلی نحوست یہ ہے کہ اس سے سنت چھوٹ جاتی ہے، جب یہ لوگ کوئی نئی بات گھڑتے ہیں تو الٹا کہتے ہیں کہ جی اس میں کیا حرج ہے؟

اہل بدعت کی اُپچ:

آج ہی ایک خاتون کا ٹیلی فون آیا (برسی کر رہے تھے، گھر کے لوگ برسی کرتے ہیں، اور اس کا کوئی دستور ہوگا، انہوں نے مقرر کیا ہوگا، تمام چیزیں رکھ دی جاتی ہیں، گھر کے تمام افراد جمع ہوجاتے ہیں، مرد، عورتیں، بچے سب جمع ہوجاتے ہیں۔ اور مولوی صاحب آکر ختم شریف پڑھتے ہیں)، اس نے مجھے بتلایا اور کہنے لگی کہ: میں تمام چیزیں تیار کرکے رکھ دیتی ہوں، مگر اس مجلس میں شریک نہیں ہوتی اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایصالِ ثواب کرتی رہتی ہوں، تو مجھ سے گھر والے کہتے ہیں کہ تم خاندان میں توڑ پیدا کرتی ہو، اور مجھ سے کہتے ہیں کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی منانا منع ہے؟ اور یہ چیزیں منع ہیں؟ (سبحان اللہ!) کیا بدعت ہے۔

برسی کرنا کس قرآن میں ہے؟

میں نے کہا کہ مناظرہ کرنا ہے تو ان سے پوچھا کرو کہ کس قرآن میں لکھا ہے کہ برسی کیا کرو؟ تم اپنے رسم و رواج کرتے ہو، میں نہیں کہتا کہ اچھا کرتے ہو یا برا کرتے ہو، لیکن ان غلط رسوم کے لئے قرآن پاک کا حوالہ دیتے ہو؟ اور اگر کوئی اللہ

کا بندہ اس سے رکنا چاہے تو تم اس کی جان کو آجاتے ہو۔ کوئی نماز نہ پڑھے تو تمہارے خاندان میں توڑ پیدا نہیں ہوتا، روزہ نہ رکھے، تمہارا کچھ نہیں بگڑتا، دنیا بھر کی برائیاں اور قباحتیں اس میں پائی جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں، اور اگر تمہاری ان ایجاد کردہ بدعتوں سے کوئی بچنا چاہے تو تم اس کو بچنے کی بھی اجازت نہیں دیتے! کچھ تو خدا کا خوف کرو! شیطان نے ایک ہی سوال تمہارے کان میں ڈال دیا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اور کچھ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو: "شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا۔" فرمایا ہے۔ شیطان نیکی کے نام سے یہ برائیاں کرواتا ہے، تاکہ کوئی مولوی، مُلَّا اس کے خلاف بول بھی نہ سکے۔

قوالی "شریف":

میں نے تمہیں لطیفہ سنایا تھا کہ چھوٹی منی بسوں میں، میں سفر کیا کرتا تھا، اللہ مجھے معاف فرمائے کہ مجھے گانوں سے اتنی نفرت ہے کہ شاید دوسرے بڑے گناہوں سے اتنی نفرت نہ ہو، میں برداشت نہیں کرسکتا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، تو میں منی بس میں سوار ہوا، اس میں اس نے اپنا راگ رنگ لگایا ہوا تھا، میں نے کہا کہ بھائی! ذرا اس کو بند کردو! تو مجھے کہنے لگا کہ مولوی جی! قوالی ہے قوالی! اس کو کیسے بند کردیں؟ قوالی ہوتی ہے جو نعت گانوں کے انداز میں گائی جاتی ہے، وہ نعت بھی الٹی سیدھی ہوتی ہیں، اس کے ساتھ الٹے سیدھے الفاظ ملائے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ: بھائی! اللہ اور نبی پاک کا نام تو بہت بابرکت ہے، مگر تم ہی بتلاؤ کہ بہت ہی نفیس کھانا کسی گندی پلیٹ میں ڈال کر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کیا جائے گا یا یہ اس کھانے کی توہین ہوگی؟ یہ گانے، باجے، ساز اور ان آلات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: "انما بعثت لمحق المعازف۔" مجھ کو گانے اور بجانے کے آلات توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ جس گندگی کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے، آپ اس رسول پاک کا نام اسی میں لپیٹ کر سنتے سناتے ہو، اور دلیل پیش کرتے ہو کہ یہ قوالی ہے، تو غلط کام عبادتوں کے نام پر شیطان نے ایجاد کردیئے ہیں، اور اس کے ساتھ ''شریف'' کا لفظ بھی لگا دیا ہے۔

کعبہ اور روضۂ اطہر کی شبیہ:

اب ربیع الاول کے موقع پر میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں روضہ شریف بنتا ہے، کعبہ شریف بنتا ہے، تمہارے کراچی میں (نعوذ باللہ! استغفراللہ!) جب کراچی میں بھی روضہ شریف اور کعبہ شریف بننے لگے تو بتلاؤ دین داری کہاں رہی اور یہ نقل ہے شیعوں کی، چونکہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقبرہ بناتے ہیں، جس کو تعزیہ کہتے ہیں، تم شیعوں کی مخالفت بھی کرتے ہو، ان کو برا بھلا بھی کہتے ہو، لیکن ان کے نقش قدم کو اپناتے ہو۔ اور روضہ شریف پر لوگ دعائیں کرتے ہیں، جیسے سلام پیش کیا جاتا ہے، اور کعبہ شریف کے دروازہ پر پرچیاں لٹکواتے ہیں، یہ تمہارے کراچی میں بدعات ہورہی ہیں، اور بڑے بڑے ثقہ مولوی جلوس نکالتے ہیں۔

بدعتی دین کو ناقص سمجھتا ہے:

یہ بدعتی جو ہوتا ہے، یہ اللہ اور رسول کے دین کو ناقص سمجھتا ہے کہ یہ دین نامکمل تھا، میں اب اس کی تکمیل کرنے جارہا ہوں کہ کہیں فلاں شریف ہورہا ہے، کہیں کیا ہو رہا ہے۔ تمہیں شیطان نے ان چیزوں میں الجھادیا، مسجدیں تمہاری ویران ہوگئیں، قرآن کریم کبھی تم نے کھول کے نہیں دیکھا۔

مسلمانوں کا ماضی اور حال:

ایک وقت تھا کہ مسلمانوں کا بچہ بچہ مسجد میں حاضری دیتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے والا ہوتا تھا، ہر چھوٹا، بڑا قرآن کریم کی تلاوت کرنے والا تھا، ہر چھوٹا اور بڑا ذکر و اذکار کا پابند تھا، صبح کی دعائیں، شام کی

دعائیں، نماز کے بعد کی دعائیں، مسجد میں داخل ہونے کی دعا، نکلنے کی دعا، گھر میں دسترخوان پر بیٹھنے کی دعائیں نوک زبان پر ہوتی تھیں، اور اب تمہیں تو ''لا الٰہ الا اللہ'' بھی نہیں آتا، تمہارے پاس صرف یہ تعزیہ شریف رہ گیا ہے، تم کہتے ہو کیا حرج ہے؟

بدعات نے دین کو غرق کردیا ہے:

حرج صرف اتنا ہے کہ ان بدعات نے تمہارا دین غرق کردیا، تم نے اس کو دین سمجھ لیا، اور جو دین تھا وہ تم سے چھوٹ گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی بدعت میں مبتلا ہوجاتا ہے، اللہ پاک اس سے سنتیں چھین لیتے ہیں، محروم ہوجاتا ہے، آج یہ امت سنت نبویؐ سے محروم، بدعات وخرافات میں مبتلا ہے، اس پر مجھے ایک حدیث یاد آئی۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ:

''مَا اَحدَثَ قَومٌ بِدعَۃٌ اِلَّا رُفِعَ مِثلُھَا مِنَ السُّنَّۃِ۔''

(مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:......''جس قوم نے کوئی بدعت ایجاد کی اس سے اس کی مثل ایک سنت اٹھالی جائے گی۔''

(میرے رسالہ ''عصر حاضر حدیث نبوی ﷺ کے آئینہ میں'' کے اندر یہ حدیث موجود ہے کہ) ایک وقت آئے گا کہ لوگ بدعتوں کو سنت بنالیں گے، اور اگر کوئی اللہ کا بندہ کوشش کرے گا کہ اس بدعت کو ہٹادیا جائے اور مٹادیا جائے، تو لوگ کہیں گے کہ: ''ترک السنۃ۔'' سنت چھوڑ دی گئی۔ یہ ہم سے سنت چھڑوا رہا ہے، تم نے بدعتوں کو سنت بنالیا، بدعت کی شکل میں، سنتیں تم سے غائب ہوگئیں۔

سنت کے مطابق تھوڑا عمل بہتر ہے:

بدعت کی شکل میں زیادہ عمل کرنا، اس سے بہتر ہے کہ سنت کے مطابق تھوڑا عمل کرے، کیونکہ سنت کے مطابق جو عمل کروگے وہ ان شاء اللہ مقبول ہوگا، اللہ کی بارگاہ

میں مقبول ہوگا، اور بدعت کی شکل میں جو کام کروگے وہ مردود ہوگا، فرماتے ہیں کہ:
''مغبون'' یعنی خسارہ میں اور ہارنے والا وہ شخص ہے جس نے اپنے نفس کو ہار دیا ہو، اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جس نے اپنے دین کا خسارہ اٹھالیا ہو، نفس کو ہار دیا، یہ جواری جو ہوتے ہیں، بعض مرتبہ بیوی بچوں کو ہار دیتے ہیں، اور تم نے دنیا کا جوا کھیلا اور اس میں اپنے آپ کو ہار دیا، اور سب سے زیادہ بدقسمت اور خسارہ اٹھانے والا وہ ہے جو اپنے دین کو ہار دے، اور اس کے دین کا خسارہ ہو جائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بدعات پر نکیر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو راستہ دیا گیا ہے الحمدللہ! اتنا کشادہ ہے کہ پوری امت اس پر چل سکتی ہے اور کسی کے بھٹکنے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص امت سے الگ رہتا ہے، ”مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔“ جو شخص امت سے الگ ہوگا وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم
الحمد وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعبٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قالَ: عَلَیْکُمْ بِالسَّبِیْلِ وَالسُّنَّۃِ! فَاِنَّہٗ مَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَالسُّنَّۃِ ذَکَرَ الرَّحْمٰنَ فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ فَیُعَذِّبُہٗ، وَمَا عَلَی الْاَرْضِ عَبْدٌ عَلَی السَّبِیْلِ وَالسُّنَّۃِ ذَکَرَ اللّٰہَ فِی نَفْسِہٖ فَاقْشَعَرَّ جِلْدُہٗ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ اِلَّا کَانَ مِثْلُہٗ کَمَثَلِ شَجَرَۃٍ یبس وَرَقُھَا فَھِیَ کَذَالِکَ اِذَا اَصَابَھَا رِیْحٌ شَدِیْدٌ فَتَحَاتَّ عَنْھَا وَرَقُھَا اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ عَنْہُ خَطَایَاہُ کَمَا تحات عَنْ تِلْکَ الشَّجَرَۃِ وَرَقُھَا وَاِنَّ اقْتِصَادًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَسُنَّۃٍ خَیرٌ مِنْ اجْتِھَادٍ فِیْ خِلَافِ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَسُنَّۃٍ، فَانْظُرُوْا اَنْ یَکُوْنَ عَمَلُکُمْ اِنْ کَانَ اِجْتِھَادًا اَوْ اِقْتِصَادًا اَنْ یَّکُوْنَ ذَالِکَ عَلٰی مِنْھَاجِ الْاَنْبِیَاءِ وَسُنَّتِھِمْ۔“

(حلیۃ الاولیآء ج:۱ ص:۲۵۳)

ترجمہ:...... ’’حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ واضح راستے اور سنت کو لازم پکڑ لو، جو بندہ واضح راستہ اور سنت پر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس کو کبھی عذاب نہیں دے گا، جو بندہ کہ صحیح راستہ پر ہو اور سنت کے طریقے پر عمل کرنے والا ہو، اگر اس کو اللہ تعالیٰ کا خیال آجائے، اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے دل پر غالب آجائے اور اس کی وجہ سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، تو اس کی مثال ایسی ہے کہ پت جھڑ کے موسم میں کسی درخت کے پتے خشک ہوجائیں اور وہ جھڑنے کے قریب ہوں، اس کے بعد تیز ہوا چلے تو کثرت کے ساتھ پتے جھڑتے ہیں، اس طرح اس آدمی کے گناہ جھڑ جاتے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ جائے۔ اور ارشاد فرمایا کہ صحیح راستے پر ہوتے ہوئے اور سنت پر عمل کرتے ہوئے تھوڑا عمل کرلینا، یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی غلط راستے پر چلے اور کثرت سے عبادت کرتا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول نہیں، جس شخص کا عمل صحیح راستے پر چلتے ہوئے سنت کے مطابق ہو تو وہ شخص انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طریقے اور سنت پر ہے اور یہ شخص بڑا مبارک ہے۔‘‘

وصول الی اللہ، اتباعِ سنت سے ہی ممکن ہے:

آدمی کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ صرف ایک ذریعے سے ملتا ہے، یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے، زیادہ ٹکریں مارنے سے اللہ تعالیٰ کا راستہ

نہیں ملتا، پیشانی گھسا دیں، اس سے اللہ تعالیٰ کا راستہ نہیں ملتا، اللہ تعالیٰ اس سے خوش نہیں ہوتے، داڑھی منڈوا لیتے ہیں اور بیت اللہ شریف کا غلاف پکڑ کر روتے ہیں، میں نے لوگوں کو اس طرح کرتے دیکھا ہے، بے تحاشا روتے ہیں، بھائی! ایسی عبادت منہ پر ماردی جاتی ہے۔ جو سنت کے خلاف کام کرے اور پھر یہ چاہے کہ مجھے سنت کا راستہ مل جائے گا، اللہ تعالیٰ راضی ہوجائیں گے کلّا وربّ الکعبۃ! رب کعبہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا! صحیح طریقے پر آدمی ہو اور سنت پر ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو زندہ کرے چاہے تھوڑا تھوڑا عمل کرے ان شاء اللہ! بہت ہوجائے گا۔

حضرت نانوتویؒ کی اتباع سنت:

شاید میں نے تم لوگوں کو یہ قصہ سنایا تھا کہ سائیں توکل شاہؒ انبالہ میں تھے، اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندے تھے، انہوں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا قافلہ جارہا ہے، یہ ذرا پیچھے ہیں، تو یہ دوڑ پڑے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جاکر مل جائیں، آگے دیکھا ایک آدمی ہے، وہ ایسے جیسے کوئی کسی چیز کو تلاش کرتا ہے، تلاش کرتے ہوئے جارہا ہے تو سائیں صاحب کہتے ہیں کہ: میاں! جلدی سے آجاؤ! پنجابی زبان میں ”شوق نال پچھے پچھے آ“ یعنی شوق کے ساتھ بھاگو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قافلہ جارہا ہے، وہ صاحب کہنے لگے کہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کے نشانات دیکھ رہا ہوں اور آپؐ کے نشانِ قدم پر قدم رکھتے ہوئے چلنا چاہتا ہوں اور پھر فرمایا کہ: اس صورت میں میں دیر سے پہنچوں گا لیکن اسی راستے سے پہنچنا چاہتا ہوں۔ سائیں صاحب خواب ہی میں کہتے ہیں کہ: تمہارا کیا نام ہے؟ کہنے لگے کہ: مجھے محمد قاسم نانوتوی کہتے ہیں! سائیں صاحب نے تو ان کو چھوڑ دیا اور خود دوڑ پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قافلے کے ساتھ جاملے، آگے دیکھتے کیا ہیں کہ مولانا

محمد قاسم نانوتویؒ آگے موجود ہیں۔ انبالے کا اور دیوبند کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا، یعنی آدمی انبالے سے دیوبند جاسکتا تھا لیکن کبھی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا، جب یہ خواب سے بیدار ہوئے تو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا، ان دنوں حضرت نانوتویؒ بیمار تھے، سردی کا موسم تھا اور کوئی پھٹی پرانی سی رضائی (لحاف) اوپر لی ہوئی تھی، سائیں توکل شاہ صاحبؒ کمرے میں داخل ہوئے تو حضرتؒ پر نظر پڑی تو ارشاد فرمایا: میں نے اس آدمی کو ہی دیکھا تھا، یعنی آپؒ کو دیکھتے ہی پہچان لیا پھر اس کے بعد تو بہت ہی زیادہ تعلق ہوگیا۔ تو اصل قصہ یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرے۔

غیر مقلدین کا اتباعِ سنت کا دعویٰ:

یہاں پر ایک بات اور کہہ دوں ہمارے غیر مقلد بھائی، لوگوں کو گمراہ کردیتے ہیں کہ دیکھو سنت تو یہ ہے کہ رفع یدین اور یہاں ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ باندھنا، اور جب امام ولا الضالین کہے تو اونچی آواز سے کہے کہ آمین، میں نے تو آہستہ کہا ہے، وہ ذرہ ترنم کے ساتھ کہتے ہیں، بس دین یہی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اسّی ہزار مسئلے مرتب کئے اور بیان فرمائے تھے، ان کے نزدیک کوئی چیز بھی کام کی نہیں ہے، صرف یہ کہ نماز میں دو چار مسئلے رٹ لئے بس! اور کچھ نہیں، ان بے چاروں کے پاس عقل ہی نہیں ہے اور نہ فہم ہے۔

صحابہؓ کو دیکھنے والوں کا عمل معتبر ہے:

میں اپنے ان دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس پر تمام لوگ متفق ہیں حتیٰ کہ علامہ ذہبیؒ نے اپنی دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ ائمہ اربعہ، چار امام ہیں ناں! ان اماموں میں صرف امام ابوحنیفہؒ تابعی ہیں اور تابعی وہ کہلاتا ہے جس نے صحابی کو دیکھا ہو، امام مالکؒ تابعی نہیں ہیں اور امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ تو بہت بعد کے

لوگ ہیں۔ جس دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا اسی دن امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی، اتنے بعد کے ہیں، تو میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ جنھوں نے صحابہؓ کو دیکھا اور صحابہؓ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ اس طرح نماز پڑھی جاتی ہے، اس کو تو نماز پڑھنی نہیں آتی، مگر تم نے خیر سے کتابوں سے دیکھ کر نماز سیکھ لی؟

صحیح بخاری سے پوری نماز دکھادو!

مجھے صحیح بخاری کھول کر پوری نماز ''اللہ اکبر'' سے لے کر ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تک نماز پڑھ کے دکھادو! تم نے دو چار مسئلے صحیح بخاری سے دیکھ لئے، تمہیں معلوم نہیں کہ یہ حدیث ناسخ ہے اور یہ حدیث منسوخ، حالانکہ یہ تمام احادیث بخاری میں لکھی ہیں۔

ایک لطیفہ:

ہمارے ایک مولوی صاحب ہیں (ذرا شرم کی بات ہے) ایک حنفی عورت کا نکاح ہوگیا تھا غیرمقلد کے ساتھ، وہ کہتا ہے کہ بخاری شریف میں یہ اس طرح لکھی ہوئی ہے، (بہت تنگ ہوئی بے چاری) اس عالم کو پتہ چلا تو اس عورت سے کہنے لگے کہ: جب تمہارے شوہر آئیں تو ان سے یہ کہیئے کہ بخاری شریف میں عورتوں کا ختنہ بھی لکھا ہے، تم نے کبھی ختنہ کروایا عورت کا؟ اور بھی دو چار چیزیں ساتھ بتائیں، ذرا شرم کی بات ہے میں مناسب نہیں سمجھتا، اس آدمی نے یہ حقائق سن کر فوراً اپنے مسلک سے توبہ کرلی کہ واقعی یہ تو مغالطے ہیں اتباع سنت نہیں۔

تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، ایک واسطہ ہے امام ابوحنیفہؒ کے درمیان اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان، ان کو نماز نہیں پڑھنی آئی تمہیں نماز پڑھنی آگئی چودہ سو سال کے بعد، بہرحال سنت کے مطابق عمل کرنا اس کی بہت بڑی

فضیلت ہے اور اپنی رائے اور بدعت پر عمل کرنا یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مذموم ہے، ہدایت کا راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، بقول شیخ سعدیؒ:

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید
ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

منزل پر پہنچنے کے لئے اتباع سنت:

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور راستے کے خلاف کوئی شخص بھی راستہ اختیار کرے گا، کبھی منزل پر نہیں پہنچے گا، منزل پر پہنچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلو۔

اتباعِ نبوی ﷺ سے سرتابی تمام انبیاءؑ کی مخالفت کے مترادف ہے:

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ حقیقت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا راستہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دین عطا فرمایا گیا جو تمام انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دین کا خلاصہ ہے، اس لئے جو شخص آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتا ہے یا آپ کے راستے کے خلاف چلتا ہے حقیقت میں وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خلاف چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلنا چاہئے۔

اتباعِ سنت میں تنگی نہیں:

یہ خیال کرنا کہ ہمیں تنگی لاحق ہوجائے گی، نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے پر چلتے ہوئے کبھی کسی کو تنگی لاحق نہیں ہوگی، تنگی جب لاحق ہوتی ہے جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے کو اپناتے ہیں،

اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ وہ ایسا سمجھئے کہ جرنیلی سڑک ہے، جس میں کوئی گڑھا نہیں ہے، کوئی کھڈہ نہیں ہے، کوئی اونچ نیچ نہیں ہے، آنکھیں بند کرکے چلتے رہو اور جب ادھر یمیناً وشمالاً جاؤ گے تو پھر کسی گڑھے میں گرو گے۔

اتباعِ سنت سے انحراف میں ہی ہلاکت ہے:

حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے جامع میں حضرت سعید بن المسیبؒ سے نقل کیا ہے (سعید بن المسیبؒ سید التابعین ہیں، تمام تابعین سے افضل ہیں، حالانکہ تابعین تو بے شمار ہیں اور آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون آدمی افضل تھا کون نہیں تھا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں تو ہم بڑی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ تمام صحابہؓ میں سے بالترتیب حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور اس کے بعد عشرۂ مبشرہ افضل ہیں، وہاں تو فیصلہ ہوسکتا ہے لیکن تابعین کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوسکتا، بڑی مشکل ہے، مگر علماءؒ فرماتے ہیں کہ سید التابعین حضرت سعید بن المسیبؒ ہیں، تمام تابعین کے سردار ہیں۔ اور میں نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد ہیں تو حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں) کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حج سے واپس تشریف لائے، غالباً یہ آخری بیان تھا آپ کا، مسجد میں تشریف لے گئے، منبر پر بیٹھے اور فرمایا:

"....اَیُّھَا النَّاسُ! قَدْ سَنَّتُ لَکُمُ السُّنَنَ وَفُرِضَتْ لَکُمُ الْفَرَائِضُ وَتُرِکْتُمْ عَلَی الْوَاضِحَۃِ اِلَّا اَنْ تَضِلُّوْا بِالنَّاسِ یَمِیْنًا وَشِمَالًا....." (مؤطا امام مالک کتاب الحدود: ۴۱ باب: ۱ حدیث: ۱۰ ص: ۸۲۴ دار الاحیاء التراث)

یعنی تحقیق تمہارے لئے سنتیں جاری ہوچکی ہیں اور فرائض تم پر مقرر ہوچکے ہیں اورتم صاف سیدھے راستے پر ڈال دیئے گئے ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اندھیرے میں نہیں چھوڑ کر گئے، بلکہ صاف راستے پر چھوڑ کر گئے ہیں، سنتیں تمہارے لئے مقرر ہوچکی ہیں، فرائض تمہارے لئے مقرر ہوچکے ہیں اور زندگی کا پورا نقشہ اور پورا طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح طور پر تمہارے لئے بیان فرمادیا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ دائیں بائیں راستے پر چل کر نہ بھٹکو۔ آپ نے سنا ہے ناں! کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حوض کوثر دیا جائے گا مدینہ شریف سے لے کر یمن تک جگہ ہے وہاں تک ہوگا۔

صراطِ مستقیم کی کشادگی:

میں ایک مثال دیتا ہوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو راستہ دیا گیا ہے الحمدللہ! اتنا کشادہ ہے کہ پوری امت اس پر چل سکتی ہے اور کسی کے بھٹکنے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی شخص امت سے الگ رہتا ہے، ”مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔“ جو شخص امت سے الگ ہوگا وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

افضل الکلام:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جمعرات کو وعظ فرمایا کرتے تھے تو ارشاد فرمایا کہ: ہمارے لئے دو چیزیں ہیں: ایک چلنے کا طریقہ، اور ایک بات کرنا۔ جہاں تک بات کرنے کا تعلق ہے افضل الکلام یا اصدق الکلام فرمایا، تمام باتوں میں سب سے زیادہ سچی اور سب سے زیادہ افضل کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، قرآن مجید ہے، اس کو اختیار کرو، قرآن مجید پڑھا کرو۔

ہمارے ایک مولانا صاحب، جو حافظ تھے، فرماتے تھے کہ قرآن کریم ہم پڑھتے ہیں، مگر آگے پیچھے تو ہمیں فرصت نہیں ملتی البتہ رمضان میں پڑھتے ہیں۔

اخبار بینی کا فتنہ:

سچی بات یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کو قرآن کریم پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی، اگر اس پوری جماعت میں پوچھا جائے کہ کتنے آدمی ایسے ہیں جو ہر ماہ ایک قرآن کریم ختم کیا کرتے ہیں، شاید سوال کا جواب مشکل ہوگا، جس کو اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا ذوق عطا فرمایا ہے، اخبار تو بہت پڑھتے ہیں، میرے بعض بھائی ایسے ہیں کہ اول سے لے کر آخر تک ''میر خلیل الرحمٰن'' کے نام سے لے کر آخر تک پورا اخبار پڑھتے ہیں اور ساتھ ساتھ اشتہار بھی پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فضل فرمائے، اب اخبار اتنے موٹے موٹے ہوگئے ہیں کہ آدمی اگر پڑھنے لگے تو سارے دن میں ختم نہیں ہوسکتا، کوئی سرخی وغیرہ دیکھ لی، کوئی خاص خبر ہوئی دیکھ لی وہ تو خیر الگ بات ہے، باقی جو دوسرے قصے کہانیاں، جتنے اخبارات میں لکھے ہوئے ہیں اگر کوئی پڑھنے لگے تو میرا خیال ہے کہ نہیں پڑھ سکتا اور یہ اخبارات شیطان کی ایک ایسی ایجاد ہے جس نے امت مسلمہ کو اور اس کے اوقات کو گمراہ کرنے اور ضائع کرنے کا طریقہ ایجاد کردیا ہے۔

میرے گھر میں دو اخبار آتے ہیں، کل بھی میں نے نہیں پڑھا، اخبار میں کیا تھا کیا نہیں تھا؟ کچھ نہیں معلوم، بچے اخبار کو اِدھر اُدھر غائب کردیتے ہیں، میں تلاش بھی نہیں کرتا اور آج بھی نہیں پڑھا، کبھی کوئی اخبار سامنے آجاتا ہے تو ایک آدھ سرخی دیکھ لیتا ہوں۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب:

حضرت فرماتے تھے کہ: ایک ہے زندگی کا طریقہ اور ایک ہے کلام، تو کلاموں میں سے سب بہترین کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ سبحان اللہ! ایسا کلام، ایسا کلام کہ ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیاں ملیں، قرآن کریم کے علاوہ کوئی ایسا کلام ہے

جس کے ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملیں؟ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ میں قرآن کریم سامنے کھول کر پڑھتا ہوں تو ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر قرآن کریم بند کر کے پڑھوں، زبانی تو ایک حرف پر پچاس نیکیاں ملتی ہیں اور اگر نماز میں پڑھوں تو ایک حرف پر سو نیکیاں ملتی ہیں، مجھے دنیا کی کوئی کتاب ایسی بتاؤ کہ جس کے پڑھنے پر ہر حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہوں یا پچاس نیکیاں ملتی ہوں یا سو نیکیاں ملتی ہوں؟

اخبار بینی وقت کا ضیاع ہے:

جب تم اس کا مقابلہ کرو گے تو پھر تمہیں خود محسوس ہوگا کہ ہم اخبار پڑھ پڑھ کر وقت ضائع کر رہے ہیں، میرے پاس اور آپ کے پاس فالتو وقت نہیں ہے، چند لمحات ہیں، چند سانس ہیں جو ہمیں اللہ تعالیٰ نے گن کر دے دیئے ہیں، یہاں سے شروع ہوگا اور یہاں ختم ہوجائے گا بس۔ قبر میں تمہیں اخبار بھیج دیا کریں گے، بڑا فرصت کا وقت ہوگا، وہاں اخبار پڑھتے رہا کرنا، اگر میرے قبضۂ قدرت میں ہوتا اور حکومت میرے پاس ہوتی تو میں سب سے پہلا کام یہ کرتا کہ یہ اخبار بند کردیتا، معمولی اخبار چار صفحے کا بس یہ کافی ہے، خبریں معلوم ہوجائیں گی۔

تو سیدنا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو چیزیں ہیں ایک ''ہدی'' یعنی طریقہ اور دوسرے ''کلام'' تو جہاں تک کلام کا تعلق ہے سب سے افضل ترین کلام، سب سے اعلیٰ ترین کلام اور سب سے سچا کلام وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

اور میں نے بتا ہی دیا ہے کہ قرآن کریم کا کوئی کتاب بھی مقابلہ نہیں کرسکتی حتیٰ کہ حدیث شریف وہ بھی اللہ تعالیٰ کے کلام کا مقابلہ نہیں کرسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر ایسی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی

فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے، اللہ تعالیٰ کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جیسی ہے ویسے ہی اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر ہے، باقی یہ ضرور ہے بھائی! کہ قرآن کریم کی ایک ایک چیز سمجھنے کے لئے حدیث شریف کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ آگے میں ذکر کروں گا۔ تو ایک بات تو ہے اللہ تعالیٰ کا کلام سب سے افضل ترین کلام ہے، سب سے اعلیٰ ترین کلام ہے، سب سے سچا کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

بہترین راستہ:

دوسری چیز تھی طریقہ، راستہ ”وَاَحْسَنُ الْهَدْيِ هَدْىُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔“ سب سے بہترین طریقہ، سب سے بہترین راستہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور قرآن کریم اور حدیث شریف کے خلاف جو چلے گا اس کے بارے میں فرمایا گیا:

”شَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا، اَلَا كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔“

(مسند احمد ج:۳ ص:۳۱۹، مجمع الزوائد ج:۱ ص:۱۷۱)

ترجمہ:...... ”بدترین کام وہ ہیں جو نئے ایجاد کردہ ہوں، ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔“

یعنی ہر نئی ایجاد بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری سیرت پڑھو تمہیں کہیں نہیں ملے گا کہ سڑکوں پر، سواریوں پر بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جلوس نکالا کرتے تھے، اب یہ بتاؤ! کہ یہ بدعت نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کئے، وہ تم نے کر لئے نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! تمہیں عقل زیادہ آ گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے؟ ہر بدعت

گمراہی ہے جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، تم نے کر کے دکھایا اور ہر بدعت فی النار ہے یعنی دوزخ میں ہے۔

آرزوؤں کا وبال:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

”اَلَا لَا یَتطَاوَلَنَّ عَلَیۡکُمُ الۡاَمۡرُ فَتَقۡسُوَ قُلُوۡبُکُمۡ۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۳۶۱)

دیکھو! میں ایک مثال دیتا ہوں، ہم کپڑا نیا پہن کر کے آتے ہیں، اس کا رنگ و روغن اور ہوتا ہے، لیکن وہ دھلتے دھلتے بالکل نکھر ہی جاتا ہے، فرمایا کہ زمانہ تم پر طویل نہ ہوجائے، ورنہ تمہارے دل سخت ہوجائیں گے اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی باتیں تمہارے دل پر اثر نہیں کریں گی، دل کو اللہ تعالیٰ نے اخّاذ بنایا ہے یعنی اخذ کرنے والا اور دل ہوگیا ہے سخت، کوئی چیز اس پر اثر ہی نہیں کرتی اور فرمایا کہ یہ دنیا کی آرزوئیں تمہیں غافل نہ کردیں، آدمی یہ کہتا ہے کہ یہ کام بھی ابھی کرنا ہے، یہ کام بھی کرنا ہے اس پریشانی میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ موت کا فرشتہ آجاتا ہے، کہتا ہے کہ چلئے! کہتا ہے کہ: کہاں چلیں؟ کہنے لگا کہ: حکم آگیا ہے چلنے کا!

خواہشات اور موت کا چوکٹا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نقشہ بنا کر کے دکھایا، ایک چوکٹا بنایا اور اس چوکٹے کے درمیان میں ایک لکیر کھینچی اور لکیر کھینچنے کے بعد اس کے ارد گرد لکیریں کھینچیں، فرمایا میں نے کیا بنایا ہے؟ صحابہؓ نے کہا: اللہ ورسولہ اعلم! اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ جو میں نے چوکٹا بنایا ہے، چارخانہ یہ تو انسان کی اجل ہے جو اس کے

چاروں طرف سے محیط ہے اور یہ درمیان میں بندہ ہے، چل رہا ہے اور یہ جو ارد گرد میں نے نشانات لگائے ہیں، یہ آدمی کے لئے رکاوٹیں ہیں، کوئی اِدھر سے کھینچ رہا ہے، کوئی اُدھر سے کھینچ رہا ہے اور آدمی کی خواہش اس دائرے سے باہر ہے، آدمی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

خواہشات کو دل سے نکال دو:

خواہش کرو ہی کیوں؟ نکال دو خواہش کو، میرے اللہ نے روزی دینی ہے، روز کی روز دینی ہے، تین دن کے بعد اگر چوتھا دن ہو جائے تو آدمی کے لئے مردار حلال ہو جاتا ہے، میرے خیال میں ہم میں سے پوری جماعت میں ایک آدمی کو بھی یہ قصہ پیش نہیں آیا ہو گا کہ تین دن ہم پر گزر گئے ہوں اور چوتھا دن آگیا تو ہم پر مردار حلال ہو گیا۔ وہ روز کے روز لئے کھڑا ہے، تم کس لئے فکر مند ہوتے ہو؟ تمہارے سوچنے سے اور کرنے سے ہوگا کچھ نہیں اور ان کے کرنے سے سب کچھ ہو جائے گا، تو جس کے کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے تم اسی کو کیوں نہیں پکڑ لیتے؟

گیا وقت نہیں آتا:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور جو چیز آنے والی نہیں وہ بہت دور ہے، وہ لمحہ جس لمحہ میں میں نے بات شروع کی تھی وہ لمحہ دوبارہ واپس نہیں آسکتا، رسّے ڈال کر کھینچ لیں تب بھی واپس نہیں آسکتا اور جو وقت آنے والا ہے آئندہ اور انہی میں ہماری موت بھی ہے وہ بہت قریب ہے، ہم چاہے اس کو دور سمجھیں، وہ دور نہیں ہے بہت نزدیک ہے۔

اتباع سے وصول، بدعت سے دوری ہوتی ہے:

”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اَ لْاِقْتِصَادُ فِی السُّنَّةِ اَحْسَنُ مِنَ الْاِجْتِهَادِ فِی الْبُدْعَةِ۔“

(مستدرک حاکم ج:۱ ص:۱۰۳)

ترجمہ:......"حضرت امام حاکم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سنت میں پیروی کرنا، میانہ روی کرنا یعنی آہستہ چال چلنا، ذرا ٹھہر کے چلنا، جلد بازی نہ کرنا یہ زیادہ بہتر ہے بہ نسبت بدعت کے کام میں محنت کرنے سے۔"

اتباعِ سنت کے کام میں تو آدمی آہستہ چلے، چلتا رہے گا، چلتا رہے گا انشاء اللہ! منزل پر پہنچ جائے گا۔ اور خلافِ سنت کام میں آدمی اگر محنت بھی کرے جتنا محنت کرے گا اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے دور جائے گا، اس لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرو اور ہم نے جو چیز اپنے ماحول میں دیکھی، ارد گرد دیکھی اس کا اعتبار نہیں ہے بھائی۔

پیچھے چلنے سے پہنچ جاؤ گے:

"عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: نَزَلَ الْقُرْآنُ وَسَنَّ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ السُّنَنَ. ثُمَّ قَالَ: اِتَّبِعُوْنَا فَوَاللهِ! اِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا تَضِلُّوْا۔"

(مسند احمد ج:۴ ص:۴۴۵)

ترجمہ:......"حضرت عمران بن حصینؓ (میں نے بتایا تھا کہ یہ باپ اور بیٹا دونوں صحابی ہیں رضی اللہ عنہما، اللہ تعالیٰ ان دونوں سے راضی ہو) وہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کریم نازل ہوا اور قرآن کریم کی آیات تمہارے سامنے آگئیں اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے لئے سنتیں جاری کردیں۔ اور پھر ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو! (حضرت

عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے پیچھے پیچھے چلو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے چلنے والے تھے اور ہم ان کے پیچھے چلیں) تو تم منزل پر پہنچ جاؤ گے اور اگر تم ہمارے پیچھے نہیں چلے، اپنا الگ راستہ اختیار کرلیا تو گمراہ ہوجاؤ گے۔‘‘

سب کچھ قرآن میں نہیں ہے:

’’عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَیْنٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ قَالَ لِرَجُلٍ: اِنَّکَ اِمْرَؤٌ اَحْمَقُ! اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ الظُّھْرَ اَرْبَعًا لَا تَجْھَرُ فِیْھَا بِالْقِرَاءَۃِ؟ ثُمَّ عَدَّدَ عَلَیْہِ الصَّلَاۃَ وَالزَّکَاۃَ وَنَحْوَ ھٰذَا، ثُمَّ قَالَ: اَتَجِدُ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ مُفَسَّرًا؟ اِنَّ کِتَابَ اللّٰہِ اَبْھَمَ ھٰذَا وَاِنَّ السُّنَّۃَ تَفَسِّرُ ذَالِکَ۔‘‘

(حیاۃ الصحابہ ج:۵ ص:۳۶۲)

ترجمہ:......’’ایک شخص نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما (سے یہ کہا کہ فلاں چیز مجھے قرآن کریم میں نہیں ملی) نے فرمایا: تم احمق آدمی ہو! تم یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں یہ چیز ملتی ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور ان میں قرأت جہر سے نہیں کی جاتی؟ یہ چیز تمہیں قرآن میں ملتی ہے؟ کہنے لگا کہ: نہیں! کہنے لگے کہ: یہ چیز تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں بتائی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو سمجھ رہے تھے اور اس کو بیان فرما رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم نازل ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ فجر کی دو رکعتیں ہیں۔‘‘

کہیں دو رکعتیں فجر کی لکھی ہوئی ہیں قرآن کریم میں؟ ظہر کی چار رکعتیں

فرض ہیں، عصر کی چار رکعتیں فرض ہیں، مغرب کی تین رکعتیں فرض ہیں اور عشائ کی چار رکعتیں فرض ہیں، فجر، مغرب اور عشائ میں قرأت اونچی آواز سے کی جاتی ہے، ظہر اور عصر میں اونچی نہیں کی جاتی، یہ کہیں لکھا ہوا ہے قرآن کریم میں؟ کہا: نہیں! کہنے لگے: احمق آدمی! یہ باتیں تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لی ہیں اور اگر تم اس سے منکر ہوجاؤ گے تو کافر ہوجاؤ گے۔

منکرین حدیث کا مغالطہ:

ہمارے منکرین حدیث کو سب سے بڑا مغالطہ یہی ہوا کہ یہ چیز قرآن کریم میں نہیں ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا تھا اور بالکل صحیح فرمایا تھا کہ تم دو رکعتیں قرآن کریم سے پڑھ کر سنا دو اور زیادہ نہیں کہتا، اس سے بحث نہیں کہ تم کون سی رکعت پڑھو، رات کی پڑھو، دن کی پڑھو، دو رکعتیں پڑھ کے قرآن کریم سامنے رکھ کر ہمیں پڑھ کر سنادو۔ کوئی افلاطون کا بیٹا بھی نہیں کرسکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تئیس سال نماز پڑھ کرکے دکھائی ہے، وہ تمہارے نزدیک حجت نہیں نعوذ باللہ! استغفراللہ! جن پر یہ قرآن کریم نازل ہوا اور انہوں نے اس قرآن کریم پر عمل کرکے یہ نمازیں پڑھائیں، نماز فرض بھی پڑھائی، نماز نفل بھی پڑھائی، سنتیں بھی پڑھائیں اور وتر بھی پڑھائے اور پڑھے بھی، تم ان کو کہتے ہو کہ ایسی چیز ہے۔

نہیں بھائی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طریقہ سے جو کام کیا ہے اس کو پورا کرو بس! قرآن کریم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہیں تھا، قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا اور ہمیں سمجھایا، صحابہ کرامؓ کو سمجھایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سمجھایا، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کو سمجھایا اور چلتے چلتے یہ ہم تک پہنچا، الحمدللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی متواتر ہم تک پہنچے ہیں۔

اتباعِ صحابہؓ کی ترغیب:

ایک چھوٹی سی حدیث اور سنادیتا ہوں:

’’عَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: مَنْ کَانَ مُسْتَنًّا فَلْیَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَاِنَّ الْحَیَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَیْهِ الْفِتْنَةُ، اُولٰئِکَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانُوْا اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبَرُّهَا قُلُوْبًا، وَاَعْمَقُهَا عِلْمًا، وَاَقَلُّهَا تَکَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهِ لِصُحْبَةِ نَبِیِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِیْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰی اٰثَرِهِمْ، وَتَمَسَّکُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِیَرِهِمْ فَاِنَّهُمْ کَانُوْا عَلَی الْهُدٰی الْمُسْتَقِیْمِ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۳۲)

ترجمہ:...... ’’حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: جس شخص کو اقتدا کرنی ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہؓ کی اقتدا کرے، جو کہ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں، کیونکہ جو زندہ آدمی ہے اس کے بارے میں کیا معلوم کہ خدانخواستہ فتنے میں مبتلا ہوجائے اور یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تھے، ان کے دل امت میں سب سے زیادہ پاکیزہ تھے، اور ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا، ان میں سب سے زیادہ کم تکلف تھا، ان کا طریقہ سب سے زیادہ سیدھا تھا اور ان کی حالت سب سے زیادہ اچھی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے چنا۔‘‘

وہ کتنے خوش قسمت ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چنا تھا، ہم بھی تو پہلے آسکتے تھے، لیکن ہمیں اپنے وقت پر آنا ہوا۔

میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس وقت پہنچایا، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی ہدایت عطا فرمادی، اگر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ہمیں سمجھ میں نہ آتیں، خدا جانے ابوجہل کے ساتھ ہوتے؟ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہماری حفاظت فرمائی۔

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت کا اعتراف کرو اور ان کے نشانِ قدم پر چلو! اس لئے کہ وہ سیدھی ہدایت پر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے طریقے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآن کریم سیکھ کر پڑھنے کے فضائل

قرآن کریم کی تلاوت کی ایک منزل مقرر کرلو، بدن کی غذا کے لئے تم دو وقت کی روٹی کھانا ضروری سمجھتے ہو کہ نہیں؟ اب تو دو وقت کا نہیں بلکہ چار وقت کا ضروری سمجھتے ہیں، کم سے کم قرآن کریم کو غذا سمجھ کر اس کی تلاوت کرو، اور یہ سوچ لو کہ مجھے روزانہ اتنی خوراک لینی ہے اور نفس سے کہہ دو کہ برخوردار! یہ تو تم سے کام کروانا ہی کروانا ہے، بے ہودہ مشاغل، لایعنی کام اور بے مصرف ضرورتوں کو ختم کردو، قرآن کریم کی تلاوت کو اپنا یومیہ معمول بناؤ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”تَعلَّمُوا كِتَابَ اللهِ فَإِنَّهُ اَفْضَلُ الْحَدِيْثِ، وَتَفَقَّهُوا فِى الدِّيْنِ فَإِنَّهُ رَبِيْعُ الْقُلُوْبِ، وَاسْتَشْفُوا بِنُوْرِهٖ فَإِنَّهُ شِفَاءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ، وَاَحْسِنُوا تِلَاوَتَهٗ فَإِنَّهُ اَحْسَنَ الْقَصَصِ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْكُمْ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ، وَاِذَا هُدِيْتُمْ لِعِلْمِهٖ فَاعْمَلُوْا بِمَا عَلِمْتُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ، فَإِنَّ الْعَالِمَ الْعَامِلَ بِغَيْرِ عِلْمِهٖ كَالْجَاهِلِ الْجَائِرِ الَّذِىْ لَا يَسْتَقِيْمُ عَنْ جَهْلِهٖ بَلْ قَدْ رَأَيْتُ اَنَّ الْحُجَّةَ اَعْظَمُ وَالْحَسْرَةُ اَدْوَمُ عَلٰى هٰذَا الْعَالِمِ الْمُنْسَلِخِ مِنْ عِلْمِهٖ عَلٰى هٰذَا الْجَاهِلِ الْمُتَحَيِّرِ فِىْ جَهْلِهٖ، وَكِلَاهُمَا مُضَلَّلٌ مَثْبُوْرٌ، لَا تَرْتَابُوْا فَتَشُكُّوْا، وَلَا تَشُكُّوْا فَتَكْفُرُوْا، وَلَا تُرَخِّصُوْا لِاَنْفُسِكُمْ فَتَذْهَلُوْا، وَلَا تَذْهَلُوْا فِى الْحَقِّ فَتَخْسَرُوْا۔“ (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۷)

ترجمہ:.......’’اللہ کی کتاب کو سیکھو، اس لئے کہ یہ افضل کلام ہے، اور دین میں تفقہ حاصل کرو، اس لئے کہ یہ دلوں کی بہار ہے، اور اس کے نور سے شفا حاصل کرو کیونکہ وہ شفا ہے سینوں کی بیماریوں کے لئے، اور اس کی خوب تلاوت کیا کرو، اس لئے کہ یہ سب سے بہترین بیان ہے، اور جب تمہارے سامنے قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اور جب تم کو ہدایت حاصل ہوجائے اس علم کی تو جو تم نے قرآن کریم سے سیکھا ہے، تو اس پر عمل کرو تاکہ تم کو ہدایت کا راستہ نصیب ہو، پس بے شک جو عالم اپنے علم پر عمل نہ کرتا ہو وہ اس جاہل کی مانند ہے جو راستے سے بھٹکا ہوا ہو اور اپنی جہالت سے سیدھی راہ پر نہ آتا ہو، بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ جو عالم اپنے علم سے نکلا ہوا ہو اس پر حجت بڑی اور حسرت دائمی ہے بہ نسبت اس جاہل کے جو اپنے جہل میں متحیر ہے، اور دونوں گمراہ اور ہلاک ہونے والے ہیں، تردد میں نہ پڑا کرو ورنہ تم شک میں پڑ جاؤ گے، اور دینی حقائق میں شک میں نہ پڑو ورنہ تم کافر ہوجاؤ گے، اور اپنے نفسوں کے لئے رخصتیں نہ تلاش کیا کرو ورنہ تم بھول میں پڑ جاؤ گے اور حق کے معاملے میں بھول اختیار نہ کرو ورنہ تم خسارے میں پڑ جاؤ گے۔‘‘

قرآن کریم کی انفرادیت:

اس خطبہ میں پہلے یہ بات فرمائی کہ اللہ کی کتاب کو سیکھو اس لئے کہ یہ سب سے بہتر کلام ہے، اس سے احسن، اس سے افضل، اس سے انفع اور اس سے بہتر کوئی

کلام نہیں ہے۔

میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ محض اس کی تلاوت کرنا، اس کا پڑھنا موجب اجر وثواب ہو، جبکہ قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے کہ اس کے الفاظ کی تلاوت بھی موجب اجر وثواب ہے، صرف اس کے الفاظ کو زبان پر جاری کرنا بھی مستقل عبادت ہے، چنانچہ ایک حدیث کا مضمون ہے:

”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا اَبَاذَرٍّ! لَاَنْ تَغْدُوْ فَتَعَلَّمَ آیَـةً مِّنْ کِتَابِ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّکَ مِنْ اَنْ تُصَلِّیَ مِائَةَ رَکْعَةٍ وَلَاَنْ تَغْدُوْ فَتَعَلَّمَ بَابًا مِّنَ الْعِلْمِ عَمِلَ بِهٖ اَوْ لَمْ یَعْمَلْ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تُصَلِّیَ اَلْفَ رَکْعَةٍ۔“

(ابن ماجہ ص:۲۰)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! تو اس طور پر صبح کرے کہ قرآن کریم کی ایک آیت سیکھ لے، یہ تیرے لئے ایک سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے، اور یہ کہ تو اس طور پر صبح کرے کہ دین کا ایک باب سیکھ لے چاہے تو اس پر عمل کرے یا نہ کرے، تیرے لئے ایک ہزار رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔“

ایک آیت سیکھنے کا ثواب:

پہلی بات کہ ایک آیت سیکھ لے یہ سو رکعت نفل پڑھنے سے بہتر ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! سمجھ کر یا بے سمجھے؟ فرمایا: خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے۔ تو قرآن کریم کی ایک آیت سیکھ لیں چاہے اس کا مضمون سمجھ میں آئے یا نہیں آئے دونوں صورتوں میں یہ اجر برابر ہے۔

دوسری بات کے بارے میں صحابہ کرامؓ نے پوچھا: یا رسول اللہ! خواہ عمل

کرے یا نہ کرے؟ فرمایا: خواہ عمل کرے یا نہ کرے۔ یعنی علم سیکھنے کی فضیلت الگ ہے اور اس پر عمل کرنے کی فضیلت الگ ہے، یہ مضمون آگے آرہا ہے۔ تو کتاب اللہ کو سیکھو اور سیکھنے کا شوق پیدا کرو۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے مسجد میں تشریف لائے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کے سیکھنے اور سکھانے میں مشغول تھے، ان میں سے کچھ چھوٹی عمر کے تھے، کچھ بڑی عمر کے تھے، عام طور پر بڑی عمر کے لوگوں کی زبان سیدھی نہیں ہوتی، تلفظ میں بڑی مشکل ہوتی ہے، ان صحابہؓ میں کچھ عرب تھے، کچھ عجم تھے، عجمیوں کے لئے عربی زبان کا تلفظ مشکل ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ: ''اِقْرَؤُوْا فَکُلٌّ حَسَنٌ۔'' (مشکوٰۃ ص:۱۹۱) یعنی سب ٹھیک ہے، سیکھتے رہو۔

دورِ حاضر کی رسم:

ہمارے اس زمانے میں یہ رسم چل نکلی ہے کہ ہر چیز کو سیکھنے کی ضرورت ہے پر قرآن سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ آپ ہی آپ آجاتا ہے، کسی میاں جی کے پاس، کسی قاری صاحب کے پاس الفاظ سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، جیسے اردو الفاظ خود ہی آجاتے ہیں، ویسے ہی یہ قرآن بھی آجاتا ہے اور قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے کی ضرورت نہیں، یعنی معنی سیکھنے کی ضرورت نہیں بس ترجمہ دیکھ لینا کافی ہے، بہت سے لوگ مجھے حوالے دیا کرتے ہیں کہ فلاں سورت کی فلاں آیت میں یہ مضمون لکھا ہے میں نے اس پر عمل کیا ہے، اپنے پاس سے مسئلہ گھڑ لیتے ہیں اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ تم یہ مسئلہ بتاتے ہو۔

ایک واعظ صاحب وعظ کہہ رہے تھے، امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پاس سے گزرے، اس سے فرمایا: تم قرآن کریم کے ناسخ و منسوخ کو جانتے ہو؟ مجمل اور مفصل کو، محکم اور متشابہ کو جانتے ہو؟ اس واعظ نے کہا کہ: نہیں! فرمایا: تم سے کس

نے کہا تھا وعظ کہنے کو؟ غلط سلط جو منہ میں آئے گا ہانکو گے، تو قرآن کریم کے الفاظ کو بھی سیکھو اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے تو اس کا معنی اور مفہوم بھی سمجھو۔

سب سے آسان اور مشکل کتاب:

میں ہمیشہ ایک بات کہا کرتا ہوں، ایک فقرہ کہا کرتا ہوں کہ میں نے دنیا میں قرآن کریم سے زیادہ آسان کتاب نہیں دیکھی اور قرآن کریم سے زیادہ مشکل کتاب نہیں دیکھی، پڑھتے پڑھاتے عمریں بیت گئیں، بال سفید ہوگئے لیکن سمجھ میں نہیں آیا اور لوگ قرآن کریم کا ترجمہ دیکھ کر مجتہد بن جاتے ہیں، تو اس زمانے میں لوگوں کا یہ ذہن بن گیا ہے کہ سب کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے، لیکن قرآن کریم سیکھنے کی ضرورت نہیں، یہ اپنے آپ ہی آجاتا ہے اور یہ جو ہمارے لوگ ہیں جو علماؑ سے تھوڑا بہت تعلق رکھتے ہیں یہ تو بے چارے تھوڑا بہت اردو ترجمہ دیکھ لیتے ہوں گے، یہ جو اونچے طبقے کے لوگ ہیں ان کے لئے اردو ترجمہ دیکھنا بھی گناہ ہے، یہ انگریزوں کا ترجمہ دیکھتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ پکٹال کا ترجمہ دیکھ لیا، یوسف علی کا دیکھ لیا بس۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنی معلومات کی تصحیح کرواؤ کہ تم نے جو سیکھا ہے وہ صحیح بھی ہے؟ اور تم نے جو سمجھا ہے وہ صحیح بھی سمجھا ہے یا نہیں؟

عالمگیرؒ کی حکمت:

عالمگیرؒ کا لطیفہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے دیکھا کہ ان کے امرأ، وزرأ میں مسجد کی طرف رغبت کچھ کم ہو رہی ہے، حکم دے دیا کہ جو میاں جی سے، مسجد کے امام سے اتنی آیتیں سیکھ کے آئے گا اس کو اتنا انعام ملے گا، اور اتنی ترقیات ہوں گی، سب لوگ دوڑے میاں جی اور قاری صاحب کے پاس، یہ تو عالمگیرؒ کا انعام تھا۔

اللہ کا انعام:

عالمگیرؒ کے خدا کا انعام یہ ہے کہ قرآن کے قاری سے کہا جائے گا کہ:

’’اِقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ اٰخِرِ اٰيَةٍ تَقْرَأُهَا۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۱۸۶)

ترجمہ:......’’پڑھتا جا اور چڑھتا جا (جتنی آیتیں پڑھو گے اتنے درجے بلند کردیں گے) جس طرح تم ترتیل کے ساتھ، آہستگی کے ساتھ دنیا میں پڑھتے تھے، ویسے پڑھو، جہاں تمہارے قرآن کی آخری آیت ختم ہوگی وہی تمہارا مرتبہ ہوگا (چڑھ جاؤ جتنا تم سے اونچا چڑھا جاتا ہے، یہ ترقیات ہیں)۔‘‘

ہر عمر والا قرآن سیکھے:

تو قرآن کریم کو سیکھو بھائی! اس کے الفاظ کو بھی سیکھو، اس میں عار نہ کرو، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بہت سے ایسے تھے جن کی عمریں پختہ ہوگئی تھیں، ساٹھ سال کے تھے، ستّر سال کے تھے، اس کے باوجود انہوں نے قرآن کریم سیکھا، تو مجھے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے، وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن کریم پڑھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جن کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کوئی دس سال کی تھی، صحیح بخاری میں یہ قصہ ہے۔ تو اتنے بڑے اونچے جلیل القدر صحابی جن کا شمار ان دس صحابہؓ میں ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی تھی اور جو ’’اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ‘‘ ہیں، (اس امت میں سب سے افضل ہیں)، لیکن ان کو عار نہیں ہے کہ میں ایک چھوٹے بچے سے قرآن پڑھتا ہوں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت ابن عباسؓ کے پاس قرآن کریم کی

مشق کرتے تھے، جب کہ یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سیکھتے تھے، تو قرآن کریم کو سیکھو" فانہ افضل الحدیث" سب سے افضل حدیث اور سب سے افضل کلام ہے، "وَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ" اور دین کا فہم حاصل کرو۔

دین داری اور فہم دین:

یاد رکھو! ایک ہے دینداری، اور ایک ہے دین کا فہم، اور ایک ہے مزاج کا دین کے مطابق ڈھل جانا، یہ تین چیزیں الگ الگ ہیں۔

میں بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ ماشاءاللہ دیندار ہیں، متشرع ہیں، داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے، ماتھے پر محراب ہے، حاجی بھی ہیں، نمازی بھی ہیں لیکن مزاج دینی نہیں ہے، دین میں ڈھلا ہوا نہیں ہے، اور بہت سے ایسے ہیں کہ ماشاءاللہ دیندار ہیں، مسئلے مسائل پر عمل بھی کرتے ہیں لیکن دین کا فہم نہیں ہے، بس ایسا ہی ہے جیسے ڈاکٹر اسرار احمد ہے، خود ہی مجتہد بن گئے، اکبر مرحوم نے کہا تھا:

انہوں نے دین کب سیکھا ہے رہ کر شیخ کے گھر میں؟
پلے کالج کے چکر میں، مرے صاحب کے دفتر میں!

مطالعہ کا علم:

وہی بات جو پہلے کہہ چکا ہوں کہ ساری عمر تو انگریزی پڑھتے رہے، گھوٹتے رہے اور اپنے بیانات میں بھی حوالے نامعلوم کن کن انگریزوں کے دیتے ہیں، الفاظ تو بولتے ہی تھے، تحریر میں بھی دیکھو تو آدھے الفاظ انگریزی رسم الخط میں لکھتے ہیں، اب میرے جیسا اس کو کیا سمجھے گا؟ لیکن دین کسی سے سیکھا نہیں ہے، ان کا دین بس اپنے فہم کی پیداوار ہے، جتنا خود مطالعے سے سمجھ لیا، سمجھ لیا کسی سے سیکھنے، سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ بھائی! اپنے آپ مطالعہ کرکے آپ کبھی عدالت میں وکیل کی حیثیت سے

کھڑے نہیں ہوسکتے کہ میں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے، قانون کو جج سے زیادہ جانتا ہوں، اور ڈاکٹری کے فن کا اپنے آپ مطالعہ کرکے بھی آپ کسی ہسپتال میں مریض کا آپریشن نہیں کرسکتے بلکہ دوا بھی نہیں دے سکتے، آپ یہ کہیں کہ میں نے بہت مطالعہ کیا ہوا ہے، پوچھنے والے پوچھیں گے: ڈگری ہے؟ استادوں نے تمہارے علم کی تصدیق کی ہے یا نہیں؟ کیا قرآن اور حدیث کے علم کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ کسی استاذ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے؟ خالد اسحٰق بھی محقق، ڈاکٹر اسرار بھی محقق اور فلاں بھی محقق اور فلاں بھی محقق، بڑے اونچے اونچے القاب کے ساتھ نام چھپتا ہے، ممتاز عالم دین اسکالر، نہ شکل دین کے مطابق، نہ عقل دین کے مطابق! تفقہ فی الدین کی ضرورت ہی نہیں، جو سمجھ میں آگیا بس وہ ٹھیک ہے:

فَسَوْفَ تَرٰی اِذًا کَشَفَ الْغُبَارُ
اَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِکَ اَمْ حِمَارٌ

ترجمہ:......''یہ غبار چھٹنے دو تو جب پتہ چلے گا کہ تمہارے نیچے گھوڑا تھا یا گدھا تھا؟''

میدانِ حشر میں مقالے کام نہ آئیں گے:

وہاں میدانِ محشر میں یہ کرتب نہیں چلیں گے کہ اتنے مقالے لکھے تھے اور اس طرح اس طرح لوگ داد و تحسین دیا کرتے تھے، وہاں ایک ایک حرف کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کس سے سیکھ کر لکھا تھا؟ کیسے لکھا تھا اور کس نیت سے لکھا تھا؟ اسی لئے فرمایا: ''یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ'' (اس دن دلوں کے بھید اگل دیئے جائیں گے)، بھائی! دین کا فہم حاصل کرو، دین کے مسائل سیکھو اور ان مسائل کا صحیح فہم بھی حاصل کرو، اس لئے کہ: ''فَاِنَّهٗ رَبِیْعُ الْقُلُوْبِ'' (یہ دلوں کی بہار ہے) دین کا فہم حاصل کرنے سے دل باغ و بہار ہوجائیں گے۔

فقہ میں لطف:

ہمارے مفتی ولی حسن مرحوم جن کا ابھی رمضان میں انتقال ہوا ہے، مجھ سے فرماتے تھے کہ میں جب فقہ کی کتابیں پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا لطف آتا ہے جیسے لوگوں کو ناول افسانے پڑھنے میں لطف آتا ہے۔

فقہ قانون کو کہتے ہیں اور قانون سب سے زیادہ خشک موضوع ہے، شعروں کی کتاب پڑھنا آسان، وعظ کی کتاب پڑھنا آسان کیونکہ اس میں وعظ اور چٹکلے ہوتے ہیں اور تاریخ وسوانح پڑھنا آسان، کیونکہ اس میں قصے کہانیاں ہوتی ہیں، خالص قانونی الفاظ کا نام فقہ ہے اور پھر اس کی بال کی کھال اتارنا یہ شق کیوں رکھی گئی ہے؟ اس مسئلے میں یہ قید کیوں لگائی گئی ہے؟ لہٰذا فقہ بڑا خشک موضوع ہے، لیکن اگر کسی کو تفقہ فی الدین نصیب ہوجائے تو پھر ربیع القلوب، دلوں کی بہار بن جاتی ہے۔

قرآن سے شفا:

تیسری بات فرمائی: ”وَاسْتَشْفُوْا بِنُوْرِهٖ فَاِنَّهٗ شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ“ قرآن کے نور سے شفا حاصل کیا کرو، اس لئے کہ سینے کی بیماریوں کے لئے، یعنی روحانی بیماریوں کے لئے قرآن شفا ہے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

”وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔“ (بنی اسرائیل: ۸۲)

ترجمہ:......”اور ہم اتارتے ہیں قرآن سے وہ جو شفا ہے اور رحمت ہے اہل ایمان کے لئے۔“

آیاتِ شفا:

یہاں ایک لطیفہ ذکر کردوں کہ قرآن کریم کی چھ آیتوں میں شفا کا لفظ آیا ہے، قرآن کریم کے لئے بھی ”شفاء“ کا لفظ آیا ہے اور ایک جگہ شہد کے لئے بھی یہی

"شفاء" کا لفظ آیا ہے، بعض اکابرؒ نے فرمایا کہ ان چھ آیتوں کو جن کو آیات شفا کہا جاتا ہے آدمی پڑھ کر پانی پر دم کر کے پی لے تو اللہ تعالیٰ شفا عطا فرماتے ہیں۔

بہرحال قرآن کریم روحانی امراض کے لئے بھی شفا ہے اور جسمانی امراض کے لئے بھی شفا ہے، اور سورۂ فاتحہ کا ایک نام سورۃ الشفاء بھی ہے، ہر بیماری کا علاج سورۂ فاتحہ ہے۔ سورۂ فاتحہ اکتالیس (۴۱) مرتبہ پڑھ لو، اکتالیس مرتبہ نہیں پڑھ سکتے تو گیارہ مرتبہ پڑھ لو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرلو کہ اس کلام پاک کی برکت سے شفا عطا فرمادیں، اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی امراض سے شفا عطا فرمادیں گے۔

قرآن امراض روحانی وجسمانی کے لئے شفاء:

قرآن کریم ایسی شفا ہے کہ اس سے دلوں کے کفر دُھل جاتے ہیں، دلوں کے نفاق دُھل جاتے ہیں، دلوں کی گندگیاں دُھل جاتی ہیں، دل خوب پاک صاف ہوجاتے ہیں، لیکن قرآن کریم کے نور سے شفا حاصل کرو، نور آئے گا تو سیاہی اور سفیدی کے درمیان امتیاز ہوگا، آج کل تو ایکسرے مشینیں لگی ہوئی ہیں، اس سے پتہ چلے گا کہ اندر کیا چیز ہے؟ جب اس کی ایکسرے کی لائٹ پڑے گی تو بتائے گی کہ اندر کیا چیز ہے؟ قرآن کریم کی روشنی اور قرآن کریم کا نور اندر آئے گا، تو اپنے امراض کا پتہ چلے گا اور اگر درمیان میں دیوار حائل کردی تو پھر کیا نور پہنچے گا؟

سنوار کر تلاوت کرو:

چوتھی بات یہ فرمائی: "وَاَحْسِنُوْا تِلَاوَتَهٗ فَاِنَّهٗ اَحْسَنَ الْقَصَصِ۔" اور خوب بنا سنوار کر قرآن کریم کی تلاوت کیا کرو اس لئے کہ یہ بہترین واقعات اور بہترین بیان ہے، اللہ تعالیٰ سے بہتر کون بیان کرسکتا ہے؟ کیونکہ یہ کلام الٰہی ہے۔

قرآن میں ہر چیز کا بہترین بیان:

ہمارے امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہ ارشاد فرماتے

تھے کہ قرآن کریم میں جہاں ایک لفظ آیا ہے اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا ممکن ہی نہیں، حالانکہ دوسری جگہ قرآن کریم میں وہ لفظ موجود ہے، اگر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا جائے جو قرآن کریم ہی میں آیا ہے تو قرآن کریم کا نظم مختل ہوجائے گا، بگڑ جائے گا۔ تو قرآن کریم میں ہر چیز کا بہترین بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے اگر قرآن کریم کا فہم دیا ہو تو تم قرآن کریم کھول کر دیکھو اور قرآن کریم کا آئینہ سامنے رکھ لو اور پھر اپنا سر سے لے کر پاؤں تک، ظاہر سے لے کر باطن تک اپنے تمام اعمال کو قرآن کریم پر پیش کرو، ایک ایک چیز کو دیکھو تمہیں پتہ چلے گا کہ قرآن کیا کہتا ہے، اور میں کیا ہوں؟ قرآن کریم کی تلاوت بہترین طریقے سے کرو، بہترین طریقے سے کیسے کرو گے؟

تلاوت کی مقدار مقرر کرو:

قرآن کریم کی تلاوت کی ایک منزل مقرر کرلو، بدن کی غذا کے لئے تم دو وقت کی روٹی کھانا ضروری سمجھتے ہو کہ نہیں؟ اب تو دو وقت کا نہیں بلکہ چار وقت کا ضروری سمجھتے ہیں، ایک ناشتہ، ایک دوپہر کا کھانا اور ایک عصرانہ اور ایک عشأ کے بعد کا کھانا، چار وقت کھاتے ہیں، کم سے کم قرآن کریم کو غذا سمجھ کر اس کی تلاوت کرو، اور یہ سوچ لو کہ مجھے روزانہ اتنی خوراک لینی ہے اور نفس سے کہہ دو کہ برخوردار! یہ تو تم سے کام کروانا ہی کروانا ہے، پٹھان کے بقول کہ اب چیں کر یا می کر، یہ کالا کالا تو چھوڑتا نہیں، اب تجھے نہیں چھوڑتا یہ تو تجھ سے کام کروانا ہے، ہاں سفر ہو یا بیماری ہو تو عذر ہے، اپنی گپ تراشیوں میں، اپنے فضول اوقات میں کچھ تخفیف کرلو، بے ہودہ مشاغل، لایعنی کام اور بے مصرف ضرورتوں کو ختم کردو، قرآن کریم کی تلاوت کو اپنا یومیہ معمول بناؤ۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم کا صحیح تلفظ کرو، اس کے الفاظ صحیح ادا کرو، سیکھو اور سیکھ کر ادا کرو، میری طرح پنجابی میں قرآن نہ پڑھو۔

غور وفکر کا ثمرہ:

اور تیسری بات یہ کہ اگر تم غور کرو گے، سوچ کر پڑھو گے تو قرآن کریم کے آدھے الفاظ تو تمہیں خود سمجھ میں آنے لگیں گے۔

مدینہ طیبہ میں اقدام عالیہ میں ایک صاحب قرآن کریم کی تلاوت کرتا تھا، وہ تھا تو داڑھی منڈا مگر وہ قرآن کریم پڑھتا ہی رہتا تھا، پڑھتا ہی رہتا تھا، اس سے جب بات چیت ہوئی تو کہنے لگا میں حیدرآباد دکن کا ہوں، میں نے کہا تم نے داڑھی کیوں نہیں رکھی؟ کہنے لگا کہ یہ میری کمزوری ہے، اس نے کہا تلاوت کرتے کرتے قرآن کریم مجھے سمجھ میں آنے لگا ہے، اس کا مطلب سمجھ میں آنے لگا ہے، حالانکہ عربی نہیں پڑھی ہوئی تھی، لیکن قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ تلاوت کی برکت سے اس سے شناسائی ہوجاتی ہے، سمجھ میں آنے لگتا ہے، اسی طرح بھائی! اگر تم بھی سیکھ سیکھ کر تلاوت کرو گے تو تمہیں بھی قرآن کریم سے مناسبت ہوجائے گی اور قرآن کریم خود تم سے پیار کرنے لگے گا۔

بوقتِ تلاوت سوچنے کی چیزیں:

اور پھر تلاوت کرتے وقت یہ دو چیزیں سوچنے کی ہیں، ایک تو یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کو سنا رہا ہوں، یہ ابتدائی درجہ ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اونچا مقام عطا فرمادیں تو یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ سے سن رہا ہوں، جیسے کہ جبل طور سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا کلام سن رہے تھے، میں اللہ کا کلام سن رہا ہوں، متکلّم وہ ہیں، یہ میری زبان اسپیکر ہے، اس طرح جم کر تلاوت کرو، تو انشاءاللہ اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت کے انوار اور برکات تمہیں نصیب ہوں گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے، یہ تو اپنی تلاوت کا قصہ تھا۔

غور سے قرآن سنو:

آگے فرماتے ہیں جب قرآن کریم تمہارے سامنے پڑھا جائے تو اس کو کان لگا کر سنو، خوب متوجہ ہو جاؤ، اپنے کانوں کی ساری کھڑکیاں کھول دو اور خاموش رہو، جس محفل میں قرآن کریم پڑھا جائے اس کے لئے دو چیزوں کی شرط ہے، ایک یہ کہ جتنے حاضرین ہیں وہ سب کے سب پوری طرح قرآن کریم کی طرف کان لگائیں جیسے کسی دور کی آواز کو متوجہ ہو کر سنتے ہیں، اور اسی طرح کبھی کبھی دور کی آواز سننے کے لئے کانوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتے ہیں، اس کو عربی میں استماع کہتے ہیں، کان دھرنا، سننا نہیں بلکہ پوری طرح متوجہ ہو جانا اور اس کے لئے خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

قرأت خلف الامام:

یہ قرآن کریم کی آیت کا اقتباس ہے، قرآن کریم کی آیت کا ٹکڑا ہے، اور اسی آیت سے ہمارے امام صاحبؒ نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مقتدی کے لئے امام کے پیچھے قرأت کرنا جائز نہیں ہے، مکروہ تحریمی ہے، اس لئے کہ امام قرأت کر رہا ہے، تمہارے سامنے پڑھ رہا ہے، اس کو سنو، اس کی طرف کان لگاؤ، صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ فرمایا: ’’وَاَنْصِتُوْا‘‘ خاموش بھی رہو، سنتا ہے یا نہیں سنتا، آواز تم تک پہنچتی ہے یا نہیں پہنچتی، تمہارا فرض ہے کہ اس کی طرف کان دھر کر کے رہو، اور دوسرا فرض یہ ہے کہ خاموش رہو اور خاموش رہنا خود پڑھنے کے منافی ہے، جب خاموش رہنے کا حکم دیا تو پڑھنے کی ممانعت ہوگئی۔

نماز اور خطبے میں خاموش رہو:

حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے فتاویٰ میں اور حافظ ابن قدامہؒ نے ’’المغنی‘‘ میں اور یہ دونوں حنبلی بزرگ ہیں، امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں، دونوں نے امام احمدؒ

سے نقل کیا ہے کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ قرآن کریم کی آیت نماز اور خطبے دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے، عام طور پر آدمی پڑھتا ہو تو پڑھنے والے کے ذمہ واجب نہیں ہے کہ وہ دوسروں کا سنے بلکہ وہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کیا کرو، قرآن کریم دوسروں کے سامنے اونچی آواز سے پڑھنے کا حکم نہیں ہے، اور یہ آیت شریفہ نازل ہوئی ہے نماز اور خطبے کے بارے میں، جب نماز میں قرآن کریم کی تلاوت کی جائے تو مکمل سناٹا ہونا چاہئے اور پوری طرح لوگ قرآن کریم کی طرف متوجہ ہوں تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اسی طرح خطبے کے اندر قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے تو پورے خطبے کا بھی یہی حکم ہے، حتیٰ کہ جب خطیب یہ کہے:

”اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓـئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔“ (الاحزاب:۵۶)

ہمارے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت درود شریف پڑھنا بھی جائز نہیں ہے، جب خطبہ ہو رہا ہو اور درود شریف پڑھنا ہو تو دل میں پڑھو، نماز میں اور خطبے میں مکمل طور پر خاموشی کا اور قرآن کریم کی استماع کا یعنی کان دھرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے:

اسی لئے ہمارے امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے، مکروہ تحریمی ہے، صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، لمبا قصہ ہے، اس قصے میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا اور ہمیں نماز کا طریقہ بتایا اور آپؐ نے فرمایا کہ:

"اِذَا كَبَّرَ الْاِمَامُ فَكَبِّرُوْا، وَاِذَا قَالَ: "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" فَقُوْلُوْا: "آمِيْن" يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ، فَاِذَا كَبَّرَ وَرَكَعَ فَكَبِّرُوْا وَارْكَعُوْا، فَاِنَّ الْاِمَامَ يَرْكَعُ قَبْلَكُمْ وَيَرْفَعُ قَبْلَكُمْ ...... وَاِذَا قَالَ: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" فَقُوْلُوْا: "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" ...... وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا۔" (مسلم ج:۱ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... "جب امام اللہ اکبر کہے تو تم بھی اللہ اکبر کہو، جب امام: "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔" کہے تو تم: آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے، جب امام تکبیر کہے اور رکوع کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور رکوع کرو (پہلے نہیں کرو) اس لئے کہ امام تم سے پہلے رکوع کرتا ہے اور تم سے پہلے سر اٹھاتا ہے، اور جب امام "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہے تو تم: "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہو اور جب امام سجدہ کرے تو تم سجدہ کرو۔"

مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا:

یہ تو کہیں نہیں فرمایا کہ جب سورۂ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو، نماز کا پورا طریقہ اول سے آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ بلکہ امام مسلمؒ نے اسی حدیث میں سلیمان کی روایت قتادہ سے جو نقل کی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ: "وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔" (مسلم ج:۱ ص:۱۷۴) اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش ہوجاؤ۔ جب تکبیر کہے تو تکبیر کہو، جب قرأت کرے خاموش ہوجاؤ اور جب وہ "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔" کہے تو آمین کہو، تو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی

گنجائش مقتدی کے لئے کہاں رہی؟ حافظ ابن کثیرؒ نے سورۂ یونس کی اس آیت:

”وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَأَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِکَ، رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ۔“ (یونس:۸۸)

ترجمہ:......”اور موسیٰ (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ اے ہمارے رب! آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو سامان تجمل اور طرح طرح کے مال دنیوی زندگی میں اسی واسطے دیئے ہیں کہ وہ آپ کی راہ سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مال کو نیست و نابود کردیجئے اور ان کے دلوں کو سخت کردیجئے سو یہ ایمان نہ لانے پاویں یہاں تک کہ عذاب الیم کو دیکھ لیں۔“

آمین کہنے والا گویا تلاوت میں شامل ہے:

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا۔“ (یونس:۸۹) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی، کن دونوں کی؟ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی، حالانکہ قرآن کریم کی اس آیت میں دعا صرف حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نقل کی ہے، جیسے فرمایا: ”وَقَالَ مُوْسٰی رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ .... الخ۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، لیکن اس دعا کو نقل کرکے فرماتے ہیں: ”قَالَ قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا۔“ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی۔

حافظ ابن کثیرؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ روایت میں یوں آتا ہے

کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا کر رہے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین آمین کہہ رہے تھے، جب دعا مکمل ہوچکی تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی، یہ دعا صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نہیں تھی بلکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی بھی تھی۔

سورۂ فاتحہ دعا ہے:

سورۂ فاتحہ بھی سورۃ الدعا ہے، اس کے ناموں میں سے ایک نام سورۃ الدعا ہے، سورۃ المسئلۃ ہے، سوال کرنے کی سورۃ، اور اس سورۃ کے ختم پر شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ یہ سورۃ اللہ تعالیٰ نے بندوں کی زبان پر نازل فرمائی کہ یوں کہا کریں، ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم سے یوں مانگا کرو، امام پوری قوم کا نمائندہ ہے، وہ تمہاری درخواست بارگاہ رب العالمین میں پیش کر رہا ہے، جب اس نے: ”غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔“ تک دعا مکمل کرلی تو تم کہو: آمین، تمہاری دعا بھی ہوگئی، وہ دعا اکیلے امام کی نہیں ہے بلکہ تمہاری بھی ہے، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کی دعا تھی تو امام کی دعا بھی تمہاری آمین کہنے کے بعد پوری جماعت کی دعا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ آیت حضرت امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی دلیل ہے، حالانکہ وہ خود شافعی المذہب ہیں، اور وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کے قائل ہیں، لیکن فرماتے ہیں کہ یہ آیت دلیل ہے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی کہ جب مقتدی امام کی فاتحہ پر آمین کہہ دیتے ہیں تو یہ دعا سب کی طرف سے ہوجاتی ہے۔

تلاوت پر خاموشی سے رحمت:

تو بہرکیف قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کو سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم

کیا جائے، میں نے اپنی کتاب ’’اختلاف امت اور صراط مستقیم‘‘ میں لکھا ہے کہ:
’’لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔‘‘ کا لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ امام کے پیچھے استماع کروگے یعنی کان دھرو گے تو تم پر رحم ہوگا ورنہ نہیں ہوگا، امام اپنی پڑھ رہا ہے اور تم اپنی بانسری بجا رہے ہو، تو تم پر رحم نہیں ہوگا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر مناظرہ:

حضرت امام اوزاعیؒ نے واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک وفد حضرت امام ابوحنیفہؒ سے فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر بحث کرنے کے لئے آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ بھائی تم اتنے آدمی ہو، میں اکیلا ہوں تم اپنا ایک نمائندہ مقرر کرلو وہ مجھ سے بات کرے، انہوں نے اپنی جماعت میں جو سب سے زیادہ زبان آور تھا اس کو منتخب کرلیا، حضرت امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ تمہارا نمائندہ ہے؟ کہا کہ جی ہاں! حضرت امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ: اس کی فتح تمہاری فتح اور اس کی شکست تمہاری شکست سمجھی جائے گی؟ کہا: جی ہاں! فرمایا: پھر مسئلہ تو حل ہوگیا، امام پوری قوم کا نمائندہ ہے، اگر اس کی دعا قبول ہوگئی تو پوری جماعت کی قبول ہوگئی اور اگر امام کی نہیں ہوئی تو تم کیا قبول کرواؤ گے؟ تمہیں کون پوچھتا ہے؟ پھر تمہیں تو اس کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم دیا گیا ہے، صحیح بخاری کتاب الدعوات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
’’فَاِذَا اَمَّنَ الْقَارِی فَاَمِّنُوْا۔‘‘ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۴۷) جب قاری آمین کہے تو تم آمین کہو، قاری امام کو فرمایا، تمہیں نہیں قاری فرمایا، قاری کہتے ہیں پڑھنے والے کو، تمہیں امام کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم دیا ہے اور اس پر مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے، اتنی واضح بات میں لوگ خواہ مخواہ الجھتے ہیں، باقی انشاء اللہ پھر۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

شہادت کی فضیلت واقسام

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص روزانہ پچیس مرتبہ یہ پڑھا کرے:

”اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔“ (الاتحاف ج:۱۰ ص:۲۲۷)

اللہ پاک اس کو شہادت کی موت نصیب فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں درج فرما دیں گے، خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”....فَاِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰہِ، وَاَوْثَقُ الْعُرٰی کَلِمَةُ التَّقْوٰی، وَخَیْرُ الْمِلَلِ مِلَّةُ اِبْرَاھِیْمَ، وَخَیْرُ السُّنَنِ سُنَّةُ مُحَمَّدٍ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ)، وَاَشْرَفُ الْحَدِیْثِ ذِکْرُ اللّٰہِ وَاَحْسَنُ الْقَصَصِ ھٰذَا الْقُرْآنُ، وَخَیْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُھَا، وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا، وَاَحْسَنَ الْھَدْیِ ھَدْیُ الْاَنْبِیَاءِ، وَاَشْرَفُ الْمَوْتِ قَتْلُ الشُّھَدَاءِ، وَاَعْمَی الْعَمٰی اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْھُدٰی، وَخَیْرُ الْعِلْمِ مَا نَفَعَ، وَخَیْرُ الْھُدٰی مَا تُبِعَ وَشَرُّ الْعَمٰی عَمَی الْقَلْبِ ...... الخ۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۶ ص:۶۲۳)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: بے شک سب سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے، سب سے مضبوط کڑا تقویٰ ہے، سب سے بہتر ملت حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت ہے، سب سے بہتر طریقہ محمد

(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے، سب سے اشرف کلام اللہ کا ذکر ہے، سب سے بہتر قصہ یہ قرآن ہے، تمام کاموں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کو عزیمت سے ادا کیا جائے، اور بدترین کام وہ ہیں جو نئے نئے ایجاد کئے جائیں، سب سے بہتر طور طریقہ انبیأ علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طور طریقہ ہے، سب سے اشرف موت شہدأ کی شہادت اور ان کا قتل ہے۔"

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ شہید کا قتل ہونا سب سے اشرف موت ہے، اشرف کے معنی سب سے زیادہ بزرگی والی، سب سے زیادہ لائق عظمت۔

قرآن کریم نے حضراتِ شہدأ کا تیسرا درجہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔" (النسأ:٦٩)

ترجمہ:......"اور جس نے کہا مان لیا اللہ کا اور رسول اللہ کا تو یہ لوگ ہوں گے نبیوں کے ساتھ اور صدیقین کے ساتھ اور شہدأ کے ساتھ اور اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں کے ساتھ اور بہت ہی عمدہ ہیں یہ سب حضرات رفیق ہونے کے اعتبار سے (ان سے زیادہ عمدہ رفیق کس کو میسر آسکتے ہیں؟)۔"

قرآن کریم نے پہلا درجہ اللہ کے نبیوں کا بیان فرمایا، دوسرا صدیقین کا، تیسرا شہدأ کا اور چوتھا صالحین یعنی اعلیٰ درجہ کے نیک لوگوں کا، جن کو ہم اولیأ اللہ کہتے ہیں۔ ہم جیسے گناہگار مسلمان جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور اطاعت کی کوشش کرتے رہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو

خوشخبری دے رہے ہیں کہ: قیامت کے دن ان کا حشر نبیوں، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوگا، اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں، ”ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ“ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نصیب فرمادے۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کونصیب فرمادے، آمین!)۔

تو بہرحال شہیدوں کا مرتبہ اللہ نے تیسرے نمبر پر فرمایا ہے، انبیأ اور صدیقین کے بعد پھر شہدا کا درجہ ہے۔ اس لئے کہ سب سے اشرف و اعلیٰ موت تو حضرات انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے، اور دوسرے نمبر پر اشرف و اعلیٰ موت صدیقین کی ہے، صدیقین حضراتِ انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ملحق ہوتے ہیں۔ یعنی اپنے اوصاف اور اپنے کمالات کے اعتبار سے یہ حضرات انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مشابہ ہوتے ہیں، لیکن ان کے پاس نبوت نہیں ہوتی، ان کے بعد پھر جتنے امتی ہیں، ان سب میں سے سب سے زیادہ شریف تر موت حضراتِ شہدا کی ہے۔

شہید کسے کہتے ہیں:؟

چند باتیں یہاں سمجھ لینی چاہئیں۔

ا:......شہید کس کو کہا جاتا ہے؟

اصل شہید تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے کافروں کے ہاتھ سے قتل ہوجائے۔ میدانِ جہاد میں کافروں کے ہاتھ سے جو مسلمان قتل ہوجائے تو وہ شہید ہے۔

الف:......حضراتِ فقہأ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص میدانِ جہاد میں مقتول پایا گیا اور اس کے بدن پر زخم کا نشان تھا، لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس کو کسی کافر نے قتل کیا ہے تو وہ بھی شہید کہلائے گا۔

ب:......اسی طرح میدانِ جہاد سے کسی شخص کو زخمی ہونے کی حالت میں زندہ اٹھالیا گیا ہو، لیکن دوا داروکی، مرہم پٹی کی، کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس نے دم توڑ دیا تو وہ بھی شہید ہے۔

ج:......اسی طرح جس شخص کو ڈاکوؤں نے قتل کردیا یا ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے وہ مارا گیا، یا باغیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تو وہ بھی شہید ہے۔

د:......اسی طرح جس شخص کو کسی مسلمان نے بغیر کسی وجہ کے ظلماً قتل کردیا ہو تو وہ بھی شہید ہے۔

یہ شہدأ کی پانچ قسمیں ہوئیں جو دنیا کے احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہیں اور آخرت کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔ گویا:

۱:......جو شخص کسی کافر کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

۲:......جو شخص میدانِ جہاد میں مرا ہوا پایا گیا اور اس پر زخم کا نشان تھا، غالب یہی ہے کہ کسی کافر نے اس کو قتل کیا ہوگا یا کافر کے زخم لگانے سے قتل ہوا ہوگا۔

۳:......جو شخص زخمی حالت میں میدانِ جہاد سے لایا گیا اور ابھی تک کھانے پینے کی یا مرہم پٹی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا۔

۴:......جس شخص کو ڈاکوؤں یا باغیوں نے قتل کردیا۔

۵:......جس شخص کو کسی مسلمان نے ظلماً قتل کردیا۔

یہ پانچ قسم کے افراد فقہی اعتبار سے شہید کہلاتے ہیں۔

شہید کے احکام:

شہید کا حکم یہ ہے کہ شہید کو انہی کپڑوں میں بغیر غسل کے دفن کیا جاتا ہے، اس کو کفن نہیں پہنایا جاتا اور اس کے بدن کے کپڑے نہیں اتارے جاتے، البتہ کوئی

زائد کپڑے ہوں جیسا کہ سردیوں کے موسم میں پوستین وغیرہ پہن لیتے ہیں، جیسے صدری، وغیرہ پہن لیتے ہیں یا کوئی اور بھاری کپڑا پہن لیتے ہیں، ایسا کپڑا اگر کوئی پہنا ہوا ہوتو اس کو اتار دیا جائے گا، اسی طرح اگر اوپر چادر دینے کی ضرورت ہوتو وہ بھی دے دی جائے گی، لیکن معروف طریقے سے جیسا کہ کفن کے تین کپڑے ہوتے ہیں وہ کفن شہید کونہیں دیا جاتا، اب اس کے وجود کو ڈھانکنے کے لئے اوپر ایک چادر ڈال دیں گے، شہید کے اپنے کپڑے اس کا کفن ہیں، حالانکہ میت کو سلے ہوئے کپڑے تو نہیں پہنائے جاتے، لیکن شہید کے لئے اس کے سلے ہوئے کپڑے اس کا کفن ہیں۔

حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ:

”....وَاَنْ يُّدْفَنُوْا بِدَمَائِهِمْ وَثِيَابِهِمْ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۴۴)

ترجمہ:......”ان کو ان کے زخموں سمیت اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کیا جائے۔“

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا يُكْلَمُ اَحَدٌ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَاللهُ اَعْلَمُ بِمَنْ يُكْلَمُ فِيْ سَبِيْلِهٖ اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَجُرْحُهٗ يَثْعَبُ دَمًا، اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ وَالرِّيْحُ رِيْحُ الْمِسْكِ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ:......”جو شخص اللہ کے راستے میں شہید ہوا، وہ قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے بدن سے جہاں زخم آیا تھا، خون کا فوارہ پھوٹ رہا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا لیکن خوشبو کستوری کی ہوگی۔“

شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے:

لیکن شہید کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، امام شافعیؒ تو فرماتے ہیں کہ اس کا جنازہ بھی نہیں ہے، ویسے ہی دفن کردو، تمہاری شفاعت کی اب اس کو ضرورت نہیں رہی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: ''اَلسَّیْفُ مَحَّاءٌ لِلْخَطَایَا۔'' (کنز العمال حدیث:۳۹۶۸۸) یعنی تلوار گناہوں کو مٹانے والی ہے۔

کافر کی تلوار نے ہی اس کی شفاعت کردی اور وہ بخشا گیا۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

ترجمہ:.....''شہید کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمادیتے ہیں۔''

قبر میں اس سے حساب و کتاب نہیں ہوتا، جیسا عام مردوں سے سوال و جواب ہوتا ہے اس سے نہیں ہوتا۔

لیکن ہمارے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ شہید کا جنازہ ہے (اس پر طویل گفتگو ہے، اس علمی بحث کو یہاں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ شہید کا یہ حکم ہے، شہید کی موت اتنی قیمتی ہے کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشرف موت فرمارہے ہیں۔

شہادت کی موت کا درجہ!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی تھی، اور شہدأ آپ کے جوتوں کی خاک ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیأ کے سردار ہیں، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ،ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰ ثُمَّ اُقْتَلُ۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۲۹)

ترجمہ:......''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل ہوجاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں (یہ سلسلہ چلتا ہی رہے)۔''

ذرا اندازہ فرمالیں! جس موت کی تمنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، وہ موت کتنی اشرف اور کتنی قیمتی ہوگی؟ صحیح احادیث میں حضراتِ شہدأ کے بہت فضائل وارد ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو شہادت کی موت نصیب فرمائے، آمین!

شہید جنت الفردوس میں:

ایک روایت میں ہے کہ:

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ اُمَّ الرُّبَیِّعِ بِنْتَ الْبَرَاءِ وَھِیَ اُمُّ حَارِثَۃَ بْنِ سُرَاقَۃَ اَتَتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَا تُحَدِّثُنِیْ عَنْ حَارِثَۃَ وَکَانَ قُتِلَ یَوْمَ بَدْرٍ اَصَابَہٗ سَھْمٌ غَرْبٌ، فَاِنْ کَانَ فِی الْجَنَّۃِ صَبَرْتُ وَاِنْ کَانَ غَیْرَ ذَالِکَ اجْتَھَدْتُ عَلَیْہِ فِی الْبُکَاءِ؟ فَقَالَ: یَا اُمَّ حَارِثَۃَ! اِنَّھَا جِنَانٌ فِی الْجَنَّۃِ وَاِنَّ ابْنَکَ اَصَابَ الْفِرْدُوْسَ الْاَعْلٰی۔'' (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حارثہ بن سراقہ کی ماں ام ربیعہ بنت براُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور کہنے لگیں کہ یا رسول اللہ! میرا لڑکا سراقہ آپ کے ساتھ غزوۂ بدر میں شہید ہوگیا ہے، اگر تو اس کی بخشش ہوگئی ہے اور وہ جنت میں ہے تو میں صبر کروں،

ورنہ میں اس پر رنج وغم اور صدمہ کا اظہار کروں اور اپنا حق ادا کروں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حارثہ کی ماں! جنت ایک نہیں بہت ساری جنتیں ہیں، (اوپر نیچے سو جنتیں ہیں اور ہر جنت سے دوسری جنت کا فاصلہ اتنا ہے جتنا آسمان و زمین کا فاصلہ، سو جنتیں اوپر نیچے اتنی ہیں، اور سب سے اوپر جو جنت ہے وہ جنت الفردوس ہے) اور تیرا بیٹا سب سے اوپر کی جنت جنت الفردوس میں ہے۔"

شہید زندہ ہیں:

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔" (البقرۃ:۱۵۴)

ترجمہ:......"اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہوجاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر اس کی زندگی کا تم شعور نہیں رکھتے (اس کی زندگی تمہارے حواس سے بالاتر چیز ہے)۔"

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔" (آل عمران:۱۶۹)

ترجمہ:......"بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کے رب کے پاس ان کو رزق دیا جاتا ہے۔"

صحیح بخاری کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ:

"...... فَقَالَ اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ

..... الخ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۳۰)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ کے عرشِ اعظم کے ساتھ قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں، اور وہ شہدأ کا مستقر ہیں، وہ شہدأ کے رہنے کی جگہ ہے، اور سبز پرندوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ ان کو سواریاں عطا فرماتے ہیں اور ان کی روحیں ان سبز پرندوں میں جنت کے اندر پرواز کرتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔“

یہ قیامت سے پہلے کا قصہ ہے، قیامت کے دن ان کے ساتھ جو معاملہ ہوگا وہ تو سبحان اللہ! کیا بات ہے!

نذرانہ حیات:

لوگ بارگاہِ عالی میں مختلف نذرانے پیش کیا کرتے ہیں، شہید اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے اس نذرانہ کو قبول فرمالیتے ہیں۔

مرنا تو سب کو ہے:

باقی مرنے کو تو بالآخر سب ہی مریں گے، جیئے گا کون؟ کوئی مرنا چاہے اس کو بھی موت آئے گی، اور کوئی مرنا نہ چاہے تب بھی اس کو موت آئے گی۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ:

”قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوْا: اُخْرُجِیْ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ كَانَتْ فِی الْجَسَدِ الطَّيِّبِ اُخْرُجِیْ حَمِيْدَةً وَاَبْشِرِیْ بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبٍّ غَيْرِ غَضْبَانٍ فَلَا تَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذٰلِكَ حَتّٰى تَخْرُجَ .....

فَاِذَا کَانَ الرَّجُلُ السُّوْءُ قَالَ اُخْرُجِیْ اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْخَبِیْثَۃُ کَانَتْ فِی الْجَسَدِ الْخَبِیْثِ اُخْرُجِیْ ذَمِیْمَۃً وَاَبْشِرِیْ بِحَمِیْمٍ وَغَسَّاقٍ وَآخَرَ مِنْ شَکْلِہٖ اَزْوَاجٌ، فَمَا تَزَالُ یُقَالُ لَھَا حَتّٰی تَخْرُجَ ....الخ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۴۱)

ترجمہ:...... "نیک آدمی کے پاس جب ملک الموت آتا ہے تو فرشتہ اس کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اے پاک روح! پاک جسم میں رہنے والی، اپنے رب کی مغفرت اور رحمت و رضوان کی طرف نکل، جو تجھ پر غضبناک نہیں، (جب وہ آدمی اپنے رب کا نام سنتا ہے تو اس وقت اس کی روح کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا اتنا اشتیاق ہوجاتا ہے کہ وہ روح بے چین ہوجاتی ہے جیسا کہ پنجرہ میں پرندہ، پنجرہ توڑ کر نکلنے کے لئے مشتاق ہوتا ہے، اس مؤمن آدمی کی روح اتنی بے چین ہوجاتی ہے، اتنے میں ملک الموت اس کی روح قبض کرلیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اتنی سہولت کے ساتھ اور آسانی کے ساتھ روح نکل جاتی ہے جیسے مشکیزہ کے منہ سے قطرہ ٹپک جاتا ہے) اور دوسرے قسم کے آدمی کے پاس ملک الموت آتا ہے، تو کہتا ہے کہ اے گندی روح! جو گندے جسم میں تھی، نکل اپنے رب کے غضب کی طرف اور اس کے عذاب کی طرف (نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ!)۔"

روح تو پہلے ہی بدن میں سرایت کی ہوتی ہے، لیکن وہ بالوں تک میں سرایت کرجاتی ہے تاکہ وہ نہ نکلے اور وہ فرشتہ پھر اس کو کھینچتا ہے۔ اور فرمایا کہ بالکل ایسی مثال ہوجاتی ہے کہ دُھنی ہوئی روئی کے اندر گرم یا بھیگی ہوئی سلائی ماری جائے

اور پھر اس کو کھینچا جائے، بدن اور روح کا رشتہ چھڑانے کے لئے اس کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کوئی اس دنیا سے جانا چاہے، روح اس کی بھی نکلتی ہے اور جو نہ جانا چاہے روح اس کی بھی نکلتی ہے۔ لیکن شہید اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کی قدر افزائی فرماتے ہیں، اس کو قبول فرماتے ہیں، اس لئے فرمایا کہ: شہید کی موت اشرف موت ہے۔

یہاں پر یہ ذکر کردینا بھی ضروری ہے کہ شہید تین قسم کے ہوتے ہیں:

دنیا وآخرت کے اعتبار سے شہید:

۱:......ایک تو وہ جو دنیا وآخرت دونوں کے اعتبار سے شہید ہیں۔

آخرت کے اعتبار سے شہید:

۲:......اور ایک وہ جو دنیاوی اعتبار سے شہید نہیں، لیکن آخرت میں اس کا نام بھی شہیدوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَا تَعُدُّوْنَ الشَّہِیْدَ فِیْکُمْ؟ قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَہِیْدٌ۔ قَالَ: اِنَّ شُہَدَاءَ اُمَّتِیْ اِذًا لَقَلِیْلٌ۔ مَنْ قُتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَہِیْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَ شَہِیْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِی الطَّاعُوْنِ فَھُوَ شَہِیْدٌ، وَمَنْ مَّاتَ فِی الْبَطْنِ فَھُوَ شَہِیْدٌ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم شہید کس کو سمجھتے ہو؟ (جو جواب دیا جاسکتا تھا وہی دیا

گیا کہ) یا رسول اللہ! جو اللہ کے راستے میں قتل ہوجائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: پھر تو میری امت کے شہید بہت تھوڑے رہ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو اللہ کے راستے میں قتل کیا جائے وہ شہید ہے، اور جو اللہ کے راستہ میں مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو طاعون کی بیماری سے مرجائے وہ بھی شہید ہے، اور جو پیٹ کی بیماری سے مرے وہ بھی شہید ہے۔''

اسی طرح کوئی دریا میں ڈوب کر مرگیا وہ بھی شہید، کسی پر دیوار گرگئی یا کسی حادثہ میں مرگیا وہ بھی شہید ہے، عورت زچگی کی حالت میں مرگئی وہ بھی شہید ہے، بچہ جنتے ہوئے مرگئی وہ بھی شہید۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شہیدوں کی بہت سی قسمیں بیان فرمائی ہیں جن کو معنوی شہید کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کے احکام کے اعتبار سے شہید نہیں ہوتے، ان کو غسل دیا جائے گا، ان کو کفن پہنایا جائے گا، ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی، یہ لوگ دنیا کے اعتبار سے شہید نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی فہرست میں ان کا نام بھی شہیدوں میں لکھا جائے گا۔

دنیا والوں کے اعتبار سے شہید:

۳:...... تیسری قسم شہیدوں کی وہ ہے جن کو ہم اور آپ شہید کہتے ہیں، مگر اللہ کی فہرست میں ان کا نام شہیدوں میں نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک! وجہ یہ تھی کہ اندر ایمان صحیح نہیں تھا، جان کا نذرانہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے پیش نہیں کیا گیا، بلکہ قومی عصبیت کی بنا پر قتل کیا گیا، یا اپنی جواں مردی اور شجاعت کے جوہر دکھلانے کے لئے مرا، بہادر کہلوانے کے لئے مرا، بھائی! ان کے دلوں کو تو ہم نہیں جانتے کہ کس کی

نیت کیا ہے؟ ہم تو اس کے ساتھ معاملہ شہیدوں کا ہی کریں گے، مگر اللہ تعالیٰ دلوں کی کیفیت کو خوب جانتے ہیں، وہ صرف ظاہری عمل کو نہیں دیکھتے، یہ لوگ جو ریاکاری کے لئے یا دکھلاوے کے لئے یا کسی اور غرض اور مقصد کے لئے قتل ہوئے، چاہے میدانِ جہاد میں ہی قتل کیوں نہ ہوئے ہوں، یہ لوگ اللہ کی فہرست میں شہید نہیں ہیں، دنیاوی اور اپنے علم کے اعتبار سے ہم لوگ ان کو شہید ہی کہیں گے، باقی راہِ حق میں شہادت کی تمنا ہر مؤمن کو رکھنی چاہئے، اللہ تعالیٰ شہادت کی موت نصیب فرمائے اور اللہ تعالیٰ شہیدوں میں اٹھائے، آمین!

شہادت کی موت کی دعا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا فرماتے: یا اللہ! شہادت کی موت نصیب فرما اور اپنے رسولؐ کے شہر میں موت نصیب فرما۔ پھر فرماتے کہ عمر دو باتیں اکٹھی کیسے ہوں گی؟ شہادت کی موت بھی مانگتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں بھی مانگتے ہو، جہاد تو باہر ہوتا ہے، مدینہ میں بیٹھ کر کیسے شہادت مل جائے گی؟ خود ہی سوال کرتے تھے اور خود ہی فرماتے تھے کہ: اگر اللہ چاہے تو دونوں کو جمع کر سکتے ہیں۔ اور واقعی اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔

حصولِ شہادت کا وظیفہ:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص روزانہ پچیس مرتبہ یہ پڑھا کرے:

”اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔“

(الاتحاف ج:۱۰ ص:۲۲۷)

ترجمہ:......”یا اللہ! برکت فرما میرے لئے موت میں

اور موت کے بعد کی زندگی میں۔‘‘

اللہ پاک اس کو شہادت کی موت نصیب فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ اس کا نام شہیدوں کی فہرست میں درج فرما دیں گے، خواہ اس کی موت بستر پر ہی کیوں نہ آئے، یہ تو کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ تمنا کرو، مانگو، اور اگر تمنا ہی نہ ہو تو پھر کیسے ہوگا؟

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

’’مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۳۳۱)

ترجمہ:......’’جس نے جہاد میں حصہ نہیں لیا اور کبھی اس کے دل میں خیال بھی پیدا نہ ہوا تو وہ آدمی نفاق کی موت مرا۔‘‘

جہاد کی تمنا کرو:

جہاد کی تمنا تو کرو ناں! فی سبیل اللہ کی تمنا کرو اور اللہ سے مانگو، کیا بعید ہے کہ اللہ پاک اپنی رحمت سے ہم گناہگاروں کو بھی شہادت کی موت نصیب فرمادیں۔

حج نہ کرنے کی وعید:

اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشکوٰۃ شریف میں ہے، فرمایا کہ:

’’مَنْ لَّمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَائِرٌ اَوْ مَرَضٌ حَابِسٌ، فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًّا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۲۲۲)

ترجمہ:......’’جو شخص اس حال میں مرا کہ حج سے کوئی چیز اس کے لئے مانع نہیں تھی، نہ بیمار تھا اور نہ کسی ظالم بادشاہ نے اسے روکا تھا، پھر بھی بغیر حج کئے مرگیا تو وہ چاہے یہودی

ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے (اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں)۔‘‘

حج کی تمنا بھی نہ ہوئی اور جو شخص مرگیا باوجود قدرت کے حج نہ کیا، مال تھا امریکہ اور فرانس کی سیریں ہوتی تھیں اور دوسری لغویات میں پیسہ ضائع ہوتا تھا، لیکن حج نہیں کیا اور حج کرنے کا کیا معنی؟ اس کو تو تمنا بھی، تڑپ بھی پیدا نہیں ہوئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس کو اختیار ہے کہ چاہے یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر مرے۔ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

نیک کام کی تمنا تو کرو:

بھائی! نیک کام کرو، اگر کر نہیں سکتے تو نیک کام کی تمنا تو کرو، یہ کیا بات ہوئی کہ کام بھی نہ کرو اور کام کی تمنا بھی نہ رکھو، نیک کام کرو، نہیں کرسکتے تو کم از کم اس کی آرزو تو کرو، اللہ سے دعا تو کرو، دعا تو کرسکتے ہو کہ یا اللہ! مجھے بھی عطا فرما، مجھے بھی نصیب فرما۔

برے کام سے بچو، نہیں تو برا سمجھو:

برے کام سے بچو اور اگر بچ نہیں سکتے تو برے کام کو برا تو سمجھو اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگو کہ یا اللہ! مبتلا ہوں معاف کردے، اتنا تو کم از کم کرو، دیکھو کتنا سستا نسخہ میں نے بتلادیا۔

بدترین اندھاپن:

اس کے بعد ارشاد ہے کہ: ’’وَاَعْمَی الْعَمٰی اَلضَّلَالَۃُ بَعْدَ الْھُدٰی۔‘‘ یعنی سب سے بدتر اندھاپن یہ ہے کہ آدمی ہدایت کے بعد گمراہ ہوجائے۔

آدمی کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری آنکھیں دی ہیں اور ان آنکھوں سے نظر آتا ہے، اگر خدانخواستہ ان آنکھوں کی بینائی جاتی رہے تو اس کو ہم کہتے ہیں اندھاپن، بینائی جاتی رہی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دل میں بھی آنکھیں دی ہوئی ہیں، یہ تمہاری

ظاہری آنکھیں سیاہ وسفید کو دیکھتی ہیں، اور دل کی آنکھیں اللہ تعالیٰ نے صحیح اور غلط کو دیکھنے کے لئے دی ہیں، ظاہری آنکھوں کو اور ان کی بینائی کو عربی زبان میں ''بصارت'' کہا جاتا ہے اور دل کی آنکھوں کو اور اس کی بینائی کو عربی زبان میں ''بصیرت'' کہا جاتا ہے۔ اور اسی قوتِ بصیرت سے آدمی حق اور باطل کو پہچانتا ہے اور اسی بصیرت سے انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شناخت ہوتی ہے، اسی بصیرت کی بنا پر اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور اسی بصیرت کی بنا پر اس معرکہ کون و فساد میں حق اور باطل کی پہچان ہوتی ہے۔

بصیرت کی آنکھیں کھولو:

بہت سے لوگ مجھے خط لکھ کر پوچھتے ہیں کہ: اتنے فرقے ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، تمہیں تو یہ فرقے نظر آتے ہوں گے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جتنے آدمی ہیں، اتنے ہی فرقے ہیں، مجھ سے پوچھو تو میرا اپنا فرقہ ہے، تمہارا اپنا فرقہ ہے، ہر ایک کے نظریات اپنے اپنے ہیں، لوگ پوچھتے ہیں کہ اتنے فرقے ہیں اب ہم کس کو صحیح سمجھیں اور کس کو غلط سمجھیں؟ لیکن کبھی آپ نے خط لکھ کر مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میری آنکھیں موجود ہیں، دنیا میں بہت سے رنگ ہیں، اب ہم کس کو سفید سمجھیں اور کس کو سیاہ سمجھیں؟ کس کو پیلا سمجھیں اور کس کو سرخ سمجھیں؟ کبھی آپ نے نہیں پوچھا اس دیوار کا رنگ سفید ہے یا سیاہ ہے؟ آنکھیں کھولو! اگر پھوٹی ہوئی نہیں ہیں تو نظر آجائے گا۔

دل کی آنکھوں سے حق و باطل نظر آئے گا:

میں کہتا ہوں اور دعویٰ سے کہتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے بصیرت ماؤف نہیں کردی، دل کی آنکھیں پھوٹ نہیں گئیں، تو جاؤ جاکر ہر ایک کے پاس بیٹھو، تمہیں حق و باطل خود نظر آجائے گا۔ ہر ایک فرقہ کے جو مقتدأ ہیں، جو ان کے اصول ہیں، ان کو

دیکھو، پرکھو، جانچو، تمہیں خود نظر آجائے گا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی، سیاہ کا سیاہ اور سفید کا سفید۔ تمہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن اب اگر کوئی شخص اس بصیرت کو استعمال ہی نہ کرے تو پھر اس کا کیا علاج کروگے؟

عاقل بالغ کافر معذور نہیں:

بہت سے لوگ یہ سوال پوچھا کرتے ہیں اور یہ بہت سے لوگوں کے ذہن کا کانٹا بنا ہوا ہے کہ جو لوگ یہودیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، نصرانیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، مجوسیوں کے گھر پیدا ہوتے ہیں، تو جیسا ماں باپ کا طریقہ تھا ویسا انہوں نے اختیار کرلیا، اب ان کا کیا قصور؟ جہاں تک نابالغوں کا تعلق ہے کہ ان کو عقل نہیں تھی، میں بھی مانتا ہوں کہ ان کا کوئی قصور نہیں، میں مانتا ہوں کہ نابالغ تھے، نابالغی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا، ماں باپ کے طریقہ پر عمل کرتے تھے ان کا کوئی قصور نہیں، اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے محاسبہ نہیں فرمائیں گے۔

لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمادی، عاقل، بالغ ہوگئے، وہ دنیا کے سارے کاموں کو سمجھتے ہیں، اس بات کو نہیں سمجھتے ہیں کہ ہمارا خالق کون ہے؟ مالک کون ہے؟ انہوں نے کیوں اپنی بصیرت کو استعمال نہیں کیا اور کیوں دل کا اندھا پن قبول کیا؟ باپ دادے کی تقلید کی بھی ایک حد ہے، آدمی ہر چیز میں باپ دادا کی تقلید نہیں کرتا، بلکہ کچھ چیزیں خود سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ہدایت کا راستہ کھول دیا ہے، اور خود انسان کے دل کے اندر بھی شمع روشن کردی ہے جس کو ''بصیرت'' کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ''فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔'' (الشّمس:۸) ''اللہ تعالیٰ نے بندے کے دل میں بدکاری کو بھی اور تقویٰ کو بھی الہام کردیا۔'' انہوں نے اپنی بصیرت کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ اب اگر کوئی آدمی آنکھیں بند کرلیتا ہے یا خود اپنی آنکھیں پھوڑ لیتا ہے، تو وہ خود قصوروار اور مجرم ہے۔ اسی طرح

اگر دل کی بصیرت، دل کی آنکھیں کوئی شخص استعمال نہیں کرتا، اندھاپن اختیار کرتا ہے تو وہ بھی مجرم ہے، اور اس کو کہتے ہیں اندھاپن۔ قرآن کریم میں ہے:

”فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔“ (الحج:۴۶)

ترجمہ:......”کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔“

یہ دل کے اندھے ہیں، کچھ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہیں، یہ تو ہوا اندھاپن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”اَعْمَى الْعَمٰى اَلضَّلَالَةُ بَعْدَ الْهُدٰى۔“ یعنی سب سے بدتر اندھاپن یہ ہے کہ ہدایت کے بعد آدمی گمراہ ہو۔

ہدایت کے بعد گمراہی کی قسمیں:

ہدایت کے بعد گمراہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں:

۱:......پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان ہوگیا تھا پھر مرتد ہوگیا، (نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! اللہ اپنی پناہ میں رکھے!) مسلمان تھا پھر مرزائی بن گیا، عیسائی بن گیا، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! استغفر اللہ! تو یہ تو سب سے بدتر اندھاپن ہے کہ آنکھیں ہونے کے باوجود اس نے خود پھوڑ دیں۔

۲:......اور دوسری شکل یہ ہے کہ ہدایت اس کے سامنے بالکل کھل گئی تھی، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا: ”قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔“ یعنی ہدایت اور گمراہی دونوں بالکل الگ الگ واضح ہوچکیں، قرآن کریم کے بیانات سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی، اس طرح بالکل کھل گئے ہیں، واقعتاً اس طرح کھل گئے ہیں جس طرح کہ دن کی دوپہر میں سیاہی اور سفیدی کھل جاتی ہے۔ ہدایت کا دن چڑھ گیا اور اللہ تعالیٰ نے ہدایت بالکل کھول دی،

ہر شخص جو دیکھنا چاہے دیکھ سکتا ہے، اب اگر اندھیرا ہوتا اور نظر نہ آتا تو پھر آدمی کسی حد تک معذور تھا۔ اندھیرے میں اس طرح ٹٹولتے ہوئے لاٹھی کی جگہ سانپ ہاتھ میں آگیا تو معذور ہے، اس لئے کہ بے چارے کی بینائی ہی نہیں، لیکن دن چڑھا ہوا ہے، آنکھیں روشن ہیں، پھر لاٹھی کی جگہ سانپ پر ہاتھ ڈالتا ہے تو یہ معذور نہیں ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آفتابِ نبوت طلوع ہوجانے کے بعد اور قرآن کریم کی ہدایت کے آشکارا ہوجانے کے بعد بھی جو شخص اندھا رہتا ہے تو پھر اس سے بدتر کوئی گمراہ نہیں، قرآن کریم میں فرمایا کہ: ''فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ۔'' یعنی اب اس قرآن کریم کے بعد پھر کس کلام پاک پر ایمان لائیں گے؟ آخر ان کے ایمان لانے کے لئے کیا تدبیر اختیار کی جائے وہ تو بتاؤ! قرآن جیسی کتابِ ہدایت، ان کی ہدایت کے لئے کافی نہیں، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا رسول اور ہادی ان کو راستہ نہیں دکھا سکتا، تو اب بتاؤ کہ ان کو راستہ دکھلانے کے لئے اور ان کو ہدایت دینے کے لئے کس کو بھیجیں؟ یہ ہے اعمی العمیٰ سب سے بدتر نابیناپن اور سب سے زیادہ اندھاپن، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

اندھے پن کی دوصورتیں:

اللہ تعالیٰ دل کے اندھے پن سے محفوظ رکھے، اللہ تعالیٰ بصیرت عطا فرمائے، اس لئے فرماتے ہیں:

''اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔''

ترجمہ:...... ''یا اللہ! ہم کو حق کا حق ہونا دکھلا دیجئے اور واضح کردیجئے (کہ یہ حق ہے) اور ہمیں اس کی پیروی کی بھی توفیق عطا فرمایئے، اور ہمارے سامنے باطل کا باطل ہونا آنکھوں

سے دکھلا دیجئے اور ہمیں اس سے بچنے کی بھی توفیق عطا فرمایئے۔‘‘

یہ دو درجے ہوا کرتے ہیں، ایک یہ کہ آدمی حق و باطل کے درمیان امتیاز نہ کرسکے، یہ بھی اندھاپن ہے، اور دوسرا یہ کہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتا ہے لیکن اپنی نفسانی خواہش کی بنا پر حق کو قبول نہیں کرتا، باطل کی پیروی کرتا ہے، یہ بھی اندھاپن ہے، اس سے بھی اللہ کی پناہ!

یہودیوں کے بارے میں قرآن کریم میں ہے کہ:

’’اَلَّذِیْنَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَائَھُمْ۔‘‘

(البقرہ:)

ترجمہ:......’’یہ لوگ اس نبی کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹے کو پہچانتے ہیں۔‘‘

کبھی کسی کو اپنے بیٹے کے پہچاننے میں بھی اشتباہ ہوا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے؟ اندھیرا ہو یا دور سے نظر آئے تو کچھ اشتباہ ہوسکتا ہے کہ حد نظر وہاں تک نہیں پہنچتی، یعنی جس طرح اپنے بیٹے کو پہچاننے میں ان کو کوئی اشتباہ نہیں ہوا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت میں بھی ان کو کوئی اشکال نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود صرف دنیاوی مفادات اور دنیاوی خواہشات کی بنا پر نہیں مانا، اس سے اللہ کی پناہ!

آدمی حق کو حق سمجھ کر بھی نہ مانے اور باطل کو باطل سمجھ کر بھی نہ چھوڑے، اس سے اللہ کی پناہ!

دو روشنیوں کی ضرورت ہے:

اب یہاں پر مختصراً ایک بات اور عرض کردوں، اللہ تعالیٰ نے دو روشنیاں عطا فرمائی ہیں، ایک آدمی کے اندر کی روشنی اور ایک باہر کی روشنی۔ یہ دونوں روشنیاں ملتی ہیں تو نظر آتا ہے۔ اگر دونوں میں سے ایک نہ ہو تو نظر نہیں آتا، آنکھوں کی روشنی بھی

ہو، جو اندر کی روشنی ہے اور باہر کی روشنی بھی ہو، سورج نہ ہو تو چاند کی روشنی ہے، لائٹوں کی روشنی ہے، موم بتی کی روشنی ہے، چراغ کی روشنی ہے، جیسی روشنی ہو یہ دونوں روشنیاں ملتی ہیں، یعنی اندر کی روشنی اور باہر کی روشنی تو راستہ نظر آتا ہے اور چیزیں نظر آتی ہیں، ان میں سے ایک ہو اور ایک نہ ہو تو دکھائی نہیں دیتا۔

ٹھیک اسی طرح ایک آدمی کے دل کی روشنی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت کی روشنی ہے، یہ دونوں ملیں گی تو راستہ نظر آئے گا، تمہاری اپنی عقل و بصیرت سے راستہ کبھی بھی نظر نہیں آئے گا، جب تک اس روشنی کو، آفتابِ نبوت کی روشنی کے سامنے نہیں رکھو گے اور آفتابِ نبوت کی روشنی بھی راہ دکھلانے کے لئے کافی نہیں ہوگی، جب تک کہ تمہارے دل کی آنکھیں کھلی ہوئی نہ ہوں۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت!

دنیا و آخرت
کا تقابل

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو خوشحالی میں بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہو، اور تنگی میں بھی مانگتا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا سچا بندہ ہے، یہ ہر حالت میں مجھ سے مانگتا ہے، اور اپنے فقر کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اگر تنگی میں مانگتا ہے، اور خوشحالی میں نہیں مانگتا، تو فرماتے ہیں کہ مطلب کا یار ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

’’عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهُ خَطَبَ النَّاسَ فَحمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ! فَاِنَّ الدُّنْيَا قَدْ اَدْبَرَتْ وَاٰذَنَتْ بِوَدَاعٍ فَاِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدْ اَقْبَلَتْ وَاَشْرَفَتْ بِاِطِّلَاعٍ وَاِنَّ الْمِضْمَارَ الْيَوْمَ وَغَدًا السِّبَاقُ اَلَا وَاِنَّكُمْ فِیْ اَيَّامِ اَمَلٍ مِنْ وَرَائِهٖ اَجَلٌ، فَمَنْ قَصَرَ فِیْ اَيَّامِ اَمَلِهٖ قَبْلَ حُضُوْرِ اَجَلِهٖ فَقَدْ خَيَّبَ عَمَلُهٗ، اَلَا فَاعْمَلُوْا لِلّٰہِ فِی الرَّغْبَةِ كَمَا تَعْمَلُوْنَ لَهٗ فِی الرَّهْبَةِ، اَلَا وَاِنِّیْ لَمْ اَرَ كَالْجَنَّةِ نَائِمٌ طَالِبُهَا وَلَمْ اَرَ كَالنَّارِ نَائِمٌ هَارِبُهَا اَلَا وَاِنَّهٗ مَنْ لَّمْ يَنْفَعْهُ الْحَقُّ ضَرَّهُ الْبَاطِلُ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَقِمْ بِهِ الْهُدٰی جَارٌّ بِهِ الضَّلَالُ، اَلَا وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَی الزَّادِ، اَلَا يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا الدُّنْيَا عَرْضٌ حَاضِرٌ يَأْكُلُ مِنْهَا الْبِرُّ وَالْفَاجِرُ وَاِنَّ الْآخِرَةَ وَعْدٌ صَادِقٌ يَحْكُمُ مَلِكٌ قَادِرٌ، اَلَا اِنَّ

الشَّيطَانَ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَّاللهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ) اَيُّهَا النَّاسُ اَحْسِنُوْا فِيْ عُمْرِكُمْ تَحْفَظُوْا فِيْ عَقِبِكُمْ فَاِنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَعَدَ جَنَّتَهٗ مَنْ اَطَاعَهٗ وَوَعَدَ نَارَهٗ مَنْ عَصَاهُ، اِنَّهَا نَارٌ لَا يَهْدَأُ زَفِيْرُهَا وَلَا يُفَكُّ اَسِيْرُهَا وَلَا يُجْبَرُ كَسِيْرُهَا، حَرُّهَا شَدِيْدٌ وَقَعْرُهَا بَعِيْدٌ وَمَائُهَا صَدِيْدٌ وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اِتِّبَاعُ الْهَوٰى وَطُوْلُ الْاَمَلِ۔“

(کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۲۲۵)

ترجمہ:......”حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خطبہ دیا اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ دنیا آرہی ہے اور جارہی ہے، اور قریب ہے کہ وہ بالکل رخصت ہوجائے، آخرت آرہی ہے اور قریب ہے کہ وہ اپنا جلوہ دکھائے، آج دوڑ ہے، کل کو آگے نکلنا ہوگا، سنو! تم آرزوؤں کے دنوں میں جی رہے ہو، جن کے پیچھے اجل ہے، پس جو شخص کہ اپنی امید کے دن میں کوتاہ کاررہا ہے، اپنی موت کے آنے سے پہلے وہ نامراد گیا، سنو! اللہ کے لئے عمل کرو، رغبت میں بھی جیسا کہ تم اس کے لئے عمل کرتے ہو ڈر کی حالت میں، سنو! میں نے نہیں دیکھی جنت جیسی چیز، جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور میں نے نہیں دیکھی دوزخ جیسی کوئی چیز جس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں، سنو! جس کو حق نفع نہ دے اس کو باطل نقصان دیا کرتا ہے، اور جس کو ہدایت سیدھا نہ کرسکے، گمراہی اس میں اپنا کام کرتی ہے، سنو! تمہیں کوچ کا حکم دیا گیا ہے، اور توشے کی راہ نمائی کردی گئی

ہے، سنو! لوگو دنیا ایک سامان ہے، جو موجود ہے، اس سے نیک بھی کھاتے ہیں اور بد بھی، آخرت ایک سچا وعدہ ہے، جس میں اللہ تعالیٰ جو بادشاہ ہیں، قدرت والے ہیں، فیصلہ کریں گے، سنو! شیطان تم کو ڈراتا ہے فقر سے اور تم کو حکم دیتا ہے بے حیائی کا، اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی جانب سے مغفرت اور فضل کا، اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں، بڑے علم والے ہیں۔ لوگو! اپنی عمر میں نیک عمل کرلو، اپنی عاقبت محفوظ رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کا وعدہ کیا ہے، ان لوگوں سے جو اس کے فرماں بردار ہوں اور دوزخ سے ڈرایا ہے ان لوگوں کو جو اس کی نافرمانی کریں، خوب یاد رکھو کہ وہ ایسی آگ ہے جس کا جلانا کبھی بند نہیں ہوتا، جس کے قیدی کو کبھی رہائی نہیں ملتی، جس کے ٹوٹے ہوئے کو جوڑا نہیں جاتا، وہاں کی گرمی شدید ہے اور اس کی گہرائی بہت لمبی ہے، اور اس کا پانی پیپ کا ہے، دیکھو سب سے زیادہ خطرناک چیز جس کا مجھے تمہارے بارے میں اندیشہ ہے، وہ خواہش نفس کی پیروی کرنا اور لمبی لمبی امیدیں رکھنا ہے۔“

دنیا جارہی ہے:

یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا خطبہ ہے، اس کے اکثر الفاظ احادیث شریفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہیں، جیسا کہ ترجمے سے معلوم ہوا ہوگا، اس خطبہ میں دنیا و آخرت کا تقابل فرمایا ہے، اور دنیا اور آخرت کی کیفیت کو ذکر کر کے انسانوں کے انجام کو ذکر کیا گیا ہے، دنیا اور آخرت کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا ہماری

طرف سے پیٹھ پھیر کر جارہی ہے، اور آخرت ہماری طرف منہ کرکے آرہی ہے، یہ دو گاڑیاں ہیں، یا دو ریلیں ہیں، جو چل رہی ہیں، ایک ہم سے جدا ہورہی ہے، وہ جتنی تیز رفتار کے ساتھ چلے گی، ہم سے الگ ہوگی، اتنی ہم سے دور ہوگی، تو دنیا ہماری طرف پیٹھ پھیر کر چل رہی ہے، اور بڑی تیزی سے چل رہی ہے، اور قریب ہے کہ وہ ہم سے رخصت ہوجائے، یکسر رخصت ہوجائے۔

میں نے ایک خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں سنایا تھا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی پھر خطبہ دینے کے لئے منبر پر تشریف لے گئے، خطبہ ارشاد فرمایا اور بہت سی چیزیں ذکر فرمائیں، قیامت میں جتنے اہم واقعات تھے، ان کو ذکر فرمایا، بہت سے مضامین کو میں ذکر کرچکا ہوں، اس کے آخر میں یہ تھا کہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ دھوپ کھجوروں کی شاخوں پر اور دیواروں کے کنارے تک پہنچ گئی، اس وقت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب دنیا کی عمر بالکل اتنی ہی باقی ہے، جتنی کہ آج کا وقت، آج کے دن کے مقابلے میں باقی ہے، سوچو کہ جب دھوپ پیلی ہوگئی ہے تو سورج کے غروب ہونے میں چند منٹ باقی ہوں گے، جس طرح کہ آج کے دن کا آفتاب غروب ہوا چاہتا ہے، اسی طرح سے اس دنیا کا سورج بھی ڈوبا چاہتا ہے۔

موت قریب آرہی ہے:

ایک ہماری میعاد ہے، ہم میں سے ہر آدمی کی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ہماری میعاد شروع ہوگئی، اور اجل تک جس کو موت کہتے ہیں یہ میعاد ہماری جاری رہتی ہے، جب فرشتے ہمیں پکڑ کے لے گئے تو ہم دنیا سے غائب ہوگئے، اور

دنیا ہم سے غائب ہوگئی، ایک تو دنیا کا ہم سے جانا اور آخرت کا ہماری طرف آنا، اس اعتبار سے انفرادی طور پر ہم میں سے ایک ایک آدمی جو ایک ایک منٹ گزار رہا ہے وہ اپنی موت کو قریب لا رہا ہے اور اپنی زندگی کو پیچھے چھوڑ رہا ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ یہ دنیا ہی رخصت ہوجائے گی، آپ کو یاد ہوگا میں نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے دنیا کا اور اس دنیا کی زندگی کا برزخ کی زندگی کے مقابلے میں، اور برزخ کی زندگی کا حشر کی زندگی کے مقابلے میں اور حشر کے دن کا دوزخ یا جنت کی ابدی زندگی کے مقابلے میں موازنہ کیا تھا اور حیثیت بیان کی تھی، تو جب دنیا رخصت ہوگئی نہ دنیا رہی، نہ دنیا کی چیزیں رہیں، نہ تم رہے، نہ ہم رہے، پوری کائنات ہی ختم ہوگئی، جس کشتی میں تم سوار ہو وہ بھی ڈوبنے والی ہے، اور تم اس سے پہلے ڈوبنے والے ہو، اسی دنیا کے لئے سب کچھ کرتے ہیں، تو دنیا جارہی ہے، رخصت ہورہی ہے، یہاں تک کہ وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ وہ تم سے رخصت ہوجائے گی اور آخرت ہماری طرف منہ کرکے بھاگی ہوئی آرہی ہے، اور عنقریب وہ وقت آیا چاہتا ہے کہ جبکہ وہ اپنا جلوہ دکھائے گی۔

دنیا کی دوڑ:

پھر فرمایا کہ آج دوڑ لگ رہی ہے کل کو اس دوڑ کے نتیجے کھلیں گے کہ کون اس دوڑ میں آگے رہا؟ کون پیچھے رہا؟ اس کے نتائج کل میدان حشر میں سامنے آئیں گے۔

مال کی دوڑ:

اور یہاں دوڑ کے لئے لوگوں نے مختلف میدان منتخب کر رکھے ہیں، کسی نے مال کی دوڑ لگا رکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ میں مال زیادہ کماتا ہوں، دوسرا کہتا ہے میں زیادہ کماتا ہوں۔

برائیوں کی دوڑ:

کسی نے برائیوں کی دوڑ لگا رکھی ہے، بقول جاہلی شاعر کے:

اَلَا لَا یَجْھَلُ اَحَدٌ عَلَیْنَا
فَنَجْعَلُ فَوْقَ جَاھِلٍ جَاھِلِیْنَا

ترجمہ:......’’سنو! کوئی آدمی ہمارے ساتھ جہالت کے ساتھ پیش نہ آئے، ورنہ ہم جاہلوں سے کھل کر جہالت کیا کرتے ہیں۔‘‘

تو گویا جہالت کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔

عریانی کی دوڑ:

دور جدید کی میری محترم بہنوں نے عریانی کی دوڑ لگا رکھی ہے کہ کون زیادہ ننگی ہوکر دکھاتی ہے؟ مغرب کی صاحبزادیاں، شہزادیاں تو صرف یہاں تک پہنچ گئی ہیں، آدھی رانوں تک پہنچ گئی ہیں، اور ایک انگیا پہنی ہوتی ہے، باقی نیچے سے سب کچھ کھلا ہوا ہے، مغرب ہمیں تماشے دکھا رہا ہے، نیچے ایک جانگیہ پہنا ہوا ہے، اور اوپر ایک انگیا پہنی ہوئی ہے، بس یہی کل کائنات ہے ان کے لباس کی، اور ہماری ہندی، پاکستانی اور مشرقی بہنیں اس دوڑ کو بہت پسند کر رہی ہیں، کہا یہ جا رہا ہے کہ ہم اس دوڑ میں ان سے آگے نکل جائیں، تم نہیں آگے نکلو گے، تم جتنے چاہو بے حیا بن جاؤ، مغرب جیسے بے حیا نہیں بن سکتے، مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب ہے، تم بے حیائی کا ریکارڈ قائم نہیں کرسکتے، اس کے لئے بے ایمان ہونا شرط ہے، تمہاری مشکل یہ ہے کہ سچا یا جھوٹا، اللہ اور اس کے رسول کا نام لیتے ہو، ابھی بھارت کی ایک لڑکی نے حسینہ عالم کا انتخاب لڑا، تم نہیں لڑسکتیں، لیکن اس دوڑ میں آگے نکلنے کی کوشش تمہاری بھی ہے۔

کھیلوں کی دوڑ:

کھیلوں کے میدان میں بھی آگے نکل رہے ہو، اور دوڑ رہے ہو اور اس پر فخر کر رہے ہو، مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوگی، اگر تم یہ بتا سکو کہ قبر میں یہ کھیلوں کی دوڑ تمہیں کیا کام دے گی؟ اور میدان حشر میں تمہارے نامہ اعمال میں اس نام کی کتنی قیمت پڑے گی؟ تو دوڑ لگ رہی ہے بھئی، ڈاکوؤں کی بھی دوڑ لگ رہی ہے، کھیلوں کی بھی دوڑ لگ رہی ہے، فتنہ و فساد کی دوڑ لگ رہی ہے، عریانی اور فحاشی کی بھی، یہ ہمارے اخبار والے بھائی، اخبار بیچنے کے لئے دوڑ لگا رہے ہیں کہ لوگوں کی دلچسپی اور جاذبیت کی کون سی چیز ہوسکتی ہے؟ پوری دنیا ایک دوڑ کا میدان ہے۔

نیکیوں کی دوڑ:

اور اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جو نیکیوں کی دوڑ لگا رہے ہیں، گو نیکیوں کا رنگ پھیکا ہوتا جارہا ہے، نیکی کا ایک ظاہر ہے، ایک باطن، ایک اس کا طول و عرض ہے، ایک اس کا عمق، یعنی گہرائی، یہ الگ بات ہے، لیکن بہرحال کچھ لوگ ہیں جو اب بھی نیکیوں کا میدان جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں، اگرچہ پہلوں کی نیکی کا رنگ ہمارے رنگ سے بہت مختلف تھا، ان کی نیکی میں گہرائی پائی جاتی تھی، جذبہ عشق پایا جاتا تھا، جذبہ محبت پایا جاتا تھا، یقین پایا جاتا تھا، ایمان کی روشنی اور اطمینان کی ٹھنڈک ان کی عبادتوں میں پائی جاتی تھی، جو ہمارے یہاں نہیں، ہمارے ہاں ایمان کی روشنی پھیکی ہوگئی ہے، غرض یہ ہے کہ آج میدان ہے دوڑ کا، پوری دنیا میں آج دوڑ لگ رہی ہے، اور سباق یعنی مسابقت کا نتیجہ کل نکلے گا، ہر آدمی اپنا جائزہ لے اور سوچے کہ میں کس میدان میں دوڑ لگا رہا ہوں؟ اور اب میں نے کون سا کھیل کھیلنے کے لئے میدان منتخب کیا ہے؟ اور قیامت کے دن بلکہ اس سے بھی پہلے برزخ میں، جس دوڑ میں، میں مشغول ہوں، یہ میرے لئے رسوائی کی چیز ہوگی، یا میری سرخروئی اور نیک نامی کا

ذریعہ بنے گی؟

آرزوؤں کا گھیرا:

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جن دنوں کو کاٹ رہے ہو، چاروں طرف سے آرزوئیں اور تمنائیں تمہیں گھیرے ہوئی ہیں کہ یہ ہوجائے، یہ ہوجائے، یہ ہوجائے، کسی کو ذرا چھیڑ کر دیکھو اور پھر اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی داستان سنو، تم خاموش رہو، پھر وہ بولتا رہے گا، لیکن تمہاری تمنائیں موت سے پہلے پوری نہیں ہونے کی، جن تمناؤں اور جن آرزوؤں کو تم نے پال رکھا ہے، یہ کبھی پوری نہیں ہوسکتیں، تم نادانی بلکہ حماقت میں مبتلا ہو کہ ان تمناؤں اور آرزوؤں کو پال رہے ہو، اور اس وہم میں مبتلا ہو کہ شاید ہم اپنی آرزوئیں پوری کر کے یہاں سے جائیں گے، بھائی! کوئی آدمی اپنی آرزوئیں اس دنیا میں پوری نہیں کرسکتا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”قَالَ خَطَّ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطًّا مُرَبَّعًا وَخَطَّ خَطًّا فِی الْوَسْطِ خَارِجًا مِنْہُ وَخَطَّ خِطَطًا صِغَارًا اِلٰی ھٰذَا الَّذِیْ فِی الْوَسْطِ مِنْ جَانِبِہٖ الَّذِیْ فِی الْوَسْطِ، فَقَالَ ھٰذَا الْاِنْسَانُ وَھٰذَا اَجَلُہٗ مُحِیْطٌ بِہٖ، وَھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ خَارِجٌ اَمَلُہٗ، وَھٰذِہِ الْخِطَطُ الصِّغَارُ الْاَعْرَاضُ فَاِنْ اَخْطَاَئَہٗ ھٰذَا نَھَسَہٗ ھٰذَا وَاِنْ اَخْطَاَئَہٗ ھٰذَا نَھَسَہٗ ھٰذَا۔“

(مشکوٰۃ ص:۴۴۹)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور دائرہ بنایا اور اس دائرہ کے درمیان ایک لمبا خط کھینچا جو اس دائرہ کے باہر تک تھا، اور کئی خط چھوٹے چھوٹے بنائے جو

درمیان میں تھے، فرمایا یہ جو دائرہ میں نے بنایا ہے نا! چوکور اور مربع، یہ تو انسان کی اجل ہے، یعنی موت، اور اس کے اندر میں نے جو نشان بنایا ہے یہ انسان کھڑا ہے، اور یہ جو میں نے دائرے سے باہر، یعنی خط سے باہر ایک نشان بنایا ہے، یہ انسان کی امل اور اس کی آرزو ہے، اس کی تمنائیں ہیں، اور درمیان میں بھی نیچے بھی ایک خط کھینچ کر آدھے نشان دے دیئے تھے، فرمایا یہ جو میں نے اندر نشانات بنائے ہیں، اس کی رکاوٹیں ہیں اور اس کی تمنا کے پورے ہونے سے مانع ہیں۔“

آرزوؤں کا خون:

اول تو یہ رکاوٹیں اس کو اجازت نہیں دیں گی کہ آگے چلے، لیکن فرض کرو کہ یہ رکاوٹیں درمیان میں حائل نہ بھی ہوں، تو امل یعنی اس کی آرزو تو اجل سے باہر ہے، یہ جدھر کو بھی بھاگے گا، آگے اس کی اجل کھڑی ہے، اور اس کی آرزو اجل کے دائرے سے باہر ہے، موت سے پہلے کبھی بھی اس کی تمنا پوری نہیں ہوسکتی، آج تک کسی انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوئیں، ناکامیوں پر ناکامیاں، شکستوں پر شکستیں، رکاوٹوں پر رکاوٹیں لوگوں کو پیش آتی ہیں، اور آکر ہمارے پاس شکایت کرتے ہیں کہ مولوی جی! پتہ نہیں کیا ہوگیا؟ جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہی کام خراب ہوجاتا ہے اور جب کسی کام کو کرنے جاتا ہوں سارے مراحل طے ہوجاتے ہیں اور جب آخر میں ہوتا ہوں تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ کاش کہ ہم لوگوں کو عبرت ہوجاتی۔

ایک مثال:

یوں آتا ہے کہ دوزخ میں دوزخی کو پہاڑ پر چڑھائیں گے، جس کو قرآن کریم میں یوں فرمایا گیا ہے: ”سَاُرۡهِقُهٗ صَعُوۡدًا۔“، پتہ نہیں کتنی تکلیف کے ساتھ وہ

پہنچے گا، پیچھے ڈنڈے برسیں گے، اور اس کو کہیں گے چڑھ آگ کا پہاڑ ہے، اور جب چوٹی کے قریب پہنچے گا تو دھکے دے کر نیچے پھینک دیا جائے گا، پھر کہیں گے چڑھ، اس غریب کو یہی سزا ملتی رہے گی، جیسا کہ ہمیں یہ سزا مل رہی ہے کہ ہم آرزوؤں کے پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہیں، اس چوٹی کو سر کرنا چاہتے ہیں، اور جونہی دیکھا کہ تمنا پوری ہونے والی ہے اور مقصد پورا ہونے والا ہے، تو دھکے سے نیچے گرادیئے جاتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں پھر چڑھ، ہمیں اس کام میں لگادیا، ہماری بالکل دوزخی کی مثال ہے، بھئی تھک کر کے اس کام کو ہی چھوڑ دو اور اللہ کے سپرد کردو جو کرنا ہوگا کردے گا، اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا۔'' (ھود:۶) ساری مخلوق کے رزق کا ذمہ تو اس نے لے رکھا ہے، ''کارساز ما، در فکر کارما۔'' ہمارا کارساز ہمارے کام کی فکر میں خود لگا ہوا ہے، ''فکر ما درکار ما آزار ما'' کیا اپنے کام میں یہ ہمارے فکرمند ہونے سے کچھ بنے گا؟ نہیں! بنے بنائے گا تو کچھ نہیں سوائے تکلیف و آزار کے، جب اس کا کوئی نتیجہ نہیں تو چھوڑ دو۔

الغرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ تم آرزوؤں کے دنوں میں ہو، اجل سے پہلے پورا ہونے کی کوئی آس اور توقع نہیں، اور مرزا غالب کے بقول:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

تمہاری امیدیں مرنے سے پہلے پوری ہو نہیں سکتیں تو تم ناامید ہوجاؤ ناں۔

ہاں جن چیزوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد کا وعدہ فرمایا ہے، ان کا یقین کرو، دنیا سے تمہارا دل سرد ہوجائے، دنیا کی آرزوؤں کو پس پشت ڈال دو۔

اپنی تمام آرزوئیں اللہ کے سپرد کردو!

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ آرزوئیں خاک ہوں یا حسرتیں پامال ہوں، اب تو اس دل کو تیرے لائق بنانا ہے، قابل بنانا ہے، لات مارو ان حسرتوں کو اور پھینک ڈالو ان آرزوؤں کو، ایک کی تمنا کرو، اور بس، باقی سب تمنائیں چھوڑ دو، ہمارے خواجہ مجذوبؒ کے بقول:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تم نے کن تمناؤں کو پال رکھا ہے قلب کو پریشان کرنے کے لئے، اپنے تمام امور اس مالک کے سپرد کردو اگر اس کے رحیم ہونے پر، اس کے شفیق ہونے پر، اس کے رزاق ہونے پر، اس کے معبودِ برحق ہونے پر، اس کے مالک الملک ہونے پر اور اس کی قدرتِ کاملہ پر یقین ہے تو تم اپنی تمام آرزوئیں اس کے سپرد کردو۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

ترجمہ:......''میں نے اپنا مال و متاع تیرے سپرد کردیا، یہ کم ہے یا زیادہ، اس کا حساب آپ کرتے رہیۓ۔''

تم کس فکر میں غلطاں ہوگئے میاں! لیکن کیا کیجئے جس آدمی کو دیکھو، اس میں مبتلا ہے، جسے دیکھو اسی میں مبتلا ہے، ایک طالب علم آٹھ مرتبہ فیل ہوا، بیچارے کو آٹھویں مرتبہ کے بعد کامیابی ہوئی، اسی چیز کو سوچ لیتا کہ امتحان ہی کیا ضروری ہے؟ جاؤ اپنا کام کرو، لیکن آگے یہ جو اس کو ڈگری مل جائے گی، کاغذ کا ایک پرزہ ہوگا، آگے اسی کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوگی، کھانے پینے کی اور کام کاج کی ضرورت نہیں ہوگی، اسی طرح حسرت کا ایک میدان تم نے طے کیا، آٹھ مرتبہ کی ناکامی کے بعد،

آگے پھر ایک میدان حسرت اور ہے اسے بھی قطع کرو۔

رغبت کے دنوں میں بھی عمل کرو!

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھو جس طرح خوف کے دنوں میں اللہ کے لئے عمل کیا کرتے ہو، رغبت کے دنوں میں بھی کرو، جب بیماری میں ہوتے، پریشانی میں ہوتے، کسی تکلیف میں مبتلا ہوتے، کوئی افتاد آپڑتی ہے تو تم اللہ کی طرف بھاگتے ہو، عافیت کے زمانے میں بھی تو کرلیا کرو۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو خوشحالی میں بھی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہو، اور تنگی میں بھی مانگتا ہو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا سچا بندہ ہے، یہ ہر حالت میں مجھ سے مانگتا ہے، اور اپنے فقر کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اگر تنگی میں مانگتا ہے، اور خوشحالی میں نہیں مانگتا، تو فرماتے ہیں کہ مطلب کا یار ہے۔

تعجب ہے کہ جنت کا طالب سو رہا ہے؟

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جنت جیسی چیز کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور دوزخ جیسی چیز سے بھاگنے والے سو جائیں، میں نے جنت جیسی چیز نہیں دیکھی جس کے طلب کرنے والے بھی سو رہے ہیں، اور دوزخ جیسی چیز نہیں دیکھی جس سے بھاگنے والے بھی سو رہے ہیں، ذرا سی فکر ہوتی ہے، پریشانی ہوتی ہے تو ہماری نیند اڑ جاتی ہے، نیند نہیں آتی، اور عاشق نامراد کو عشق و محبت کی وجہ سے نیند نہیں آتی، نہ طالب سوئے، نہ خائف سوئے، لیکن عجیب بات ہے کہ جنت کے عاشق اور طالب بھی بنے پھرتے ہیں اور رات کو سوتے بھی ہیں، اور دوزخ سے بھاگنے والے اس سے خوف کرنے والے بھی بنے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی سو رہے ہیں، اگر جنت اپنی تمام حقیقتوں کے ساتھ ایک مرتبہ اپنی جھلک دکھا دیتی تو ساری عمر کے لئے نیند اڑ

جاتی پھر دوبارہ کبھی نیند نہ آتی، اور اگر دوزخ کو نزدیک سے نہیں دور سے بھی ہم ایک مرتبہ دیکھ لیتے تو پھر دوبارہ ہمیں سونا یاد نہ رہتا۔

غفلت بھی نعمت ہے:

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہ فرماتے تھے کہ بھئی یہ غفلت بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، آخرت کا، جنت کا، دوزخ کا، اگر ہمیشہ استحضار رہے تو آدمی معطل ہوکر رہ جائے، نہ کھا سکے، نہ پی سکے، نہ سو سکے، نہ بات کر سکے، بات کیا کرے گا جب کھائے گا پئے گا نہیں، سوئے گا نہیں تو بات کیا کرے گا؟ تو حضرتؒ فرماتے ہیں کہ ایک گونہ یعنی ایک درجہ میں غفلت بھی آدمی کو چاہیئے، اور اللہ کا شکر ہے کہ اللہ نے ہمیں بھی یہ نعمت عطا فرمائی، غفلت بھی ایک نعمت ہے، لیکن غفلت اتنی نہیں ہونی چاہیئے، میرے دوست مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ جی صبح اصل میں فجر کی نماز کے لئے آنکھ نہیں کھلتی، نہ بھائی! اتنی غفلت تو نہ کرو، رات کو سوجاؤ، بس اتنی غفلت بہت ہے۔

غفلت مذموم:

لیکن فرائض کے وقت میں غفلت نہیں ہونی چاہیئے، یہ غفلت مذموم ہے، اگر تمام فرائض الٰہیہ کو ادا کرتے ہو، ٹھیک ٹھیک حقوق و فرائض کو صحیح صحیح بجا لاتے ہو، اس کے باوجود ہنستے بھی ہو، سوتے بھی ہو، کھاتے بھی ہو، اپنے اہل و عیال سے بھی ملتے ہو، تو یہ غفلت محمود ہے، یہ ہونی چاہیئے، اور اگر غفلت کی حد یہاں تک پہنچ گئی کہ تمہیں گناہوں میں مبتلا کر رہی ہے اور فرائض و واجبات تم کو چھڑوا رہی ہے تو یہ غفلت مذموم ہے، اس کا علاج کراؤ۔

غفلت کا علاج:

اور حکمائے امت فرماتے ہیں کہ اس کا علاج یہی مراقبہ ہے کہ تھوڑے سے

وقت کے لئے تنہائی میں بیٹھ جایا کرو، اور اس برخوردار کو سمجھایا کرو جس کو ''نفس'' کہتے ہیں، اس کو سمجھایا کرو، اور بیٹھ کے اس سے باتیں کیا کرو کہ برخوردار! اب فرشتے آرہے ہیں تیری جان قبض کرنے کے لئے، اب تیری جان قبض ہورہی ہے، اب تجھے غسل دیا جارہا ہے، تجھے کفن میں لپیٹا جارہا ہے، اب تجھے کندھوں پر اٹھا کر لے جارہے ہیں، اب تجھے لحد میں ڈال دیا ہے، اب تیری اینٹیں بند کردی ہیں، اب تیرے پاس منکر نکیر آرہے ہیں، ان کی شکل اتنی گھناؤنی ہے، اتنی ڈراؤنی ہے کہ اللہ کی پناہ تو تو اتنا بہادر ہے کہ چوہا نکلتا ہے تو تو کانپ جاتا ہے، اس وقت تیرا کیا حال بنے گا؟ تنہائی ہے، اندھیرا ہے، کوئی مونس وغم خوار نہیں، جن کے لئے تو مارا مارا پھر رہا ہے، یہ تیرے کس کام آئے گی؟ اور پھر حشر کے میدان میں جو کچھ ہونے والا ہے، اس کو ذرا سمجھاؤ! جنت تیرے سامنے لاکر کھڑی کردی گئی ہے، اور دوسری طرف دوزخ تیرے سامنے کردی گئی ہے، بتا کس کو لینا چاہتا ہے؟ آج تو غفلت کی وجہ سے تجھے نظر نہیں آتا، یا تو احساس نہیں کرتا، لیکن اگر کوئی بے چارہ نابینا ہو اور اس کو نظر نہ آوے تو اس کے نظر نہ آنے کی وجہ سے سورج اپنا نکلنا نہیں چھوڑتا، سورج تو بہرحال طلوع ہوکر رہے گا، کیوں بھئی! حافظ جی کو نظر نہیں آتا، اب سورج اس کی رعایت تو نہیں کرے گا کہ غریب حافظ جی کو نظر نہیں آتا میں کیا نکلوں؟ اگر ہم اندھے ہوگئے ہیں آخرت سے، اور ہمیں آخرت نظر نہیں آتی، جنت سامنے نظر نہیں آتی، دوزخ سامنے نظر نہیں آتی، آنکھوں پر غفلت کی پٹی بندھی ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حقیقت کا یہ آفتاب طلوع نہیں ہوگا، وہ تو ہوکے رہے گا، اس برخوردار کو سمجھاؤ!

اپنے آپ کو کسی کے سپرد کردو!

اور ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے کہ روزانہ سونے سے پہلے کم سے کم پانچ منٹ مراقبہ کرلیا کرو، انشاءاللہ! یہ شریر بچہ تمہیں کام دینے لگے گا، سمجھ جائے گا، اور اگر

اس پر بھی نہ سمجھے تو پھر اس کو کسی سائیس کے سپرد کردو، وہ گھوڑا ہوتا ہے نا گھوڑا، اس کو سائیس کے سپرد کردیتے ہیں، جس کے ہاتھ میں ہنٹر ہوتا ہے، اور وہ ماہر اتنا ہوتا ہے کہ اس پر سوار ہوجاتا ہے، گھوڑا جتنا چاہے کودے، چھلانگ لگائے، مگر وہ نہیں گرتا، اور اس کو زور زور سے مارتا ہے، اور پھر سنگلاخ زمین پر لے جاتا ہے، جب تک وہ اپنی شوخی اور شرارت نہیں چھوڑ دیتا اور جب تک کہ وہ ڈھنگ سے کام نہیں کرنے لگتا، سائیس اس کی پشت پر رہتا ہے، اگر یہ بچہ تمہارے قابو میں نہیں آتا تو کسی سائیس کے سپرد کرو، وہ ہنٹر دکھا کر خوب انشاءاللہ! اس کی چولیں نکال دے گا، لیکن توبہ! توبہ! ایسے کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم تو بہت معزز ہیں، بڑی عزت والے ہیں، اپنے آپ کو کسی اور کے سپرد کردیں؟

غرض یہ ہے کہ جنت کے طالبوں کو سونا نہیں چاہئے، خاص طور پر فجر کے وقت اور عشاءٔ کے وقت، اور دوزخ سے بھاگنے والوں کو سونا نہیں چاہئے، جس سے نمازیں قضا ہوجائیں، فرائض شرعیہ قضا ہوجائیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف ہوجائیں، برباد ہوجائیں۔

حق سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ ....

اس کے بعد ایک بہت قیمتی بات فرمائی کہ جو شخص حق سے فائدہ نہ اٹھائے وہ باطل کا نشانہ بنا کرتا ہے، اور جس شخص کو ہدایت راہ راست پر نہ چلا سکے گمراہی اس میں اپنا کام کیا کرتی ہے، تم دیکھو اگر تم حق پر ہو تو اللہ کا شکر ادا کرو کہ باطل سے بچ گئے، اور اگر تم نے حق کا ساتھ نہیں دیا، تو باطل اپنا حصہ تم سے وصول کرے گا، اگر ہدایت کا حصہ تم نے پورا لے لیا تو ٹھیک ہے اور اگر ہدایت کا کچھ حصہ تم نے چھوڑ دیا تو گمراہی اپنا حصہ وصول کرلے گی، اور یہ کوئی عمل نہیں کہ نہ حق پر رہو، نہ باطل پر رہو، نہ صحیح ہو، نہ غلط ہو، یہ کچھ ہماری سمجھ میں آنے لگی کہ اجتماع ضدین بھی ہوجاتا ہے؟ کہ

بیک وقت ایک چیز صحیح بھی نہیں ہے اور غلط بھی نہیں ہے، اگر صحیح نہیں تھی تو بھائی تم اس کے آرزومند کیوں رہتے تھے؟ اور اگر غلط نہیں تھی تو تم اس کو چھوڑتے کیوں تھے؟

اب ہمارے بہت سے اعمال ایسے ہیں جن کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ نہ صحیح ہیں اور نہ غلط ہیں، ٹھیک ٹھاک ہے، مگر یہ کہ ہمیں تو صحیح اور غلط کا سوال ہی نہیں، ہمیں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی، تو نتیجہ یہ ہے کہ حق تو تمہارے پاس ہے نہیں، تو تم چاہو کہ باطل بھی نہ ہو، یہ نہیں ہوگا، یا تو حق کو اختیار کرلو اور پورے طور پر اختیار کرلو ورنہ جتنا حصہ حق کا چھوڑو گے اتنا حصہ باطل کا تمہارے اندر آئے گا، جتنا حصہ ہدایت کا چھوڑو گے اتنا حصہ گمراہی کا تمہارے اندر آئے گا، بس انہی کلمات پر اکتفا کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

یومِ حساب سے پہلے محاسبہ کی ضرورت

روزانہ اگر اس محاسبہ کی عادت ڈال لی جائے جبکہ کوئی تم پر ڈنڈا لے کر نہیں کھڑا اور کوئی تم پر پہرا نہیں دے رہا، انشاءَ اللہ! بہت کچھ تدارک ہوجائے گا، یہ بکھرے ہوئے بیر دوبارہ جھولی میں ڈال سکتے ہو، یہ اجڑی ہوئی کھیتی دوبارہ لہلہاسکتی ہے، بشرطیکہ اس کا انتظام کرو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی!

”..... اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّاب رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَتَبَ اِلٰی بَعْضِ عُمَّالِہٖ، فَکَانَ فِیْ اٰخِرِ کِتَابِہٖ: اَنْ حَاسِبْ نَفْسَکَ فِی الرَّخَآءِ قَبْلَ حِسَابِ الشِّدَّۃِ فِاِنَّ مَنْ حَاسَبَ نَفْسَہٗ فِی الرّخَآءِ قَبْلَ حِسَابِ الشِّدَّۃِ عَادَ مَرْجِعُہٗ اِلَی الرِّضَآءِ وَالْغِبْطَۃِ، وَمَنْ اَلْھَتْہُ حَیَاتُہٗ وَشَغَلَتْہُ سَیِّئَاتُہٗ عَادَ مَرْجِعُہٗ اِلَی النَّدَامَۃِ وَالْحَسْرَۃِ، فَتَذَکَّرْ مَا تُوْعَظُ بِہٖ لِکَیْ تَنْتَھِیَ عَمَّا تُنْھٰی عَنْہُ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۰)

”عَنْ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ کَتَبَ اِلٰی مُعَاوِیَۃَ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا: اَمَّا بَعْدُ! فَالْزِمِ الْحَقَّ یُبَیِّنُ لَکَ الْحَقُّ مَنَازِلَ اَھْلِ الْحَقِّ وَلَا تَقْضِ اِلَّا بِالْحَقِّ وَالسَّلَامُ۔“ (کنز العمال ج:۱۶ حدیث:۴۴۱۹۳)

ترجمہ:...... ”..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے

بعض گورنروں کو ایک خط لکھا اور اس کے آخر میں تھا کہ: کشائش کے زمانہ میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرو، سختی کے حساب سے پہلے، جو شخص اپنا محاسبہ کرتا رہے گا جب شدت اور سختی کا وقت آئے گا تو اس کا انجام رضائے الٰہی اور غبطہ کی شکل میں نکلے گا، اور جس کو اس کی زندگی نے غافل کردیا اور اس کی برائیوں نے اس کو مشغول رکھا، تو جب اس کا انجام نکلے گا تو نہایت ندامت اور حسرت کا انجام ہوگا، پس جو نصیحت تم کو کی جارہی ہے اس پر غور کرو تاکہ جس چیز سے رکنا چاہئے اس سے تم باز رہ سکو۔''

ترجمہ:......''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کو خط لکھا فرمایا کہ: حق کو لازم پکڑو، حق، تمہارے لئے اہل حق کے منازل واضح کردے گا، اور کوئی فیصلہ حق کے بغیر نہ کرنا۔ والسلام۔''

حضرت عمرؓ کا صحابہؓ کو نماز کی تلقین کرنا:

یہ حضرت امیرالمؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دو خطوط ہیں۔ امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے حکام، صوبے داروں اور دوسرے ایسے لوگ جو حکومت میں دخیل ہوتے ہیں، ان کو وقتاً فوقتاً نامہ گرامی لکھتے رہتے تھے، ان کو نصیحت فرماتے رہتے تھے، اور تنبیہات فرماتے تھے، مؤطا امام مالک میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا تھا کہ:

''اِنَّ اَھَمَّ اَمْرِکُم عِنْدِی الصَّلَاۃُ فَمَنْ حَافَظَ عَلَیْھَا حَافَظَ عَلٰی غَیْرِھَا وَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا

اَضْیَعُ۔‘‘ (مؤطا امام مالک ص:۵)

ترجمہ:......’’میرے نزدیک تمہارے تمام کاموں میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے، جو شخص اس کی محافظت اور پابندی کرے وہ دین کے دوسرے کاموں کی بھی پابندی کرے گا، اور جو شخص اس میں لاپروائی کرے گا اور اس کو ضائع کرے گا وہ دین کی دوسری باتوں کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کرے گا۔‘‘

اس کے بعد اسی خط میں نماز کے اوقات تحریر فرمائے ہیں کہ فلاں فلاں وقت نماز پڑھا کرو۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں طویل مدت تک رہے ہیں، اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اچھی طرح علم ہے، چند صحابہ جو بہت شدت سے روایتیں کرتے ہیں، ان میں ایک نام حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، اس کے باوجود ان کو اس معاملہ میں خط لکھ رہے ہیں تاکہ حکومت کی ذمہ داریوں، اس کی مصروفیات اور اس کی مشغولیت کی وجہ سے کسی قسم کی سستی اور تہاون پیدا نہ ہوجائے۔

کشائش کے زمانہ میں اپنے محاسبہ کی ضرورت:

یہ خط جو میں نے آپ کے سامنے پڑھے ہیں ان میں سے پہلا خط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک عامل کو یعنی حاکم اور گورنر کو لکھا اور اس میں بہت ساری باتیں تحریر فرمائیں تھیں، اس کے آخر میں یہ تحریر فرمایا کہ کشائش کے زمانے میں اپنے نفس کا محاسبہ کیا کرو، جبکہ تم پر پکڑ دھکڑ کرنے والا کوئی نہیں، اور تمہیں کسی سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں، اس وقت اپنے آپ کا محاسبہ کیا کرو۔ سختی کے حساب سے پہلے۔ سختی کا حساب ہے قیامت کے دن کا حساب۔

امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فقرہ عام طور پر مشہور ہے کہ: ’’اپنا حساب کرلو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب کیا جائے۔‘‘ یہی مطلب ہے اس جملہ کا بھی کہ شدت کا حساب پیش آنے سے پہلے پہلے کشائش، نرمی اور فراخی کے زمانے میں اپنا حساب کیا کرو۔

محاسبہ سے پہلے محاسبہ کے فوائد:

اس کے بعد فرمایا: جو شخص شدت کے زمانے سے پہلے پہلے کشائش کے زمانے میں اپنا حساب کرلیتا ہے اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ جب اس کا حساب ہوگا، تو اس کا نتیجہ رضا اور غبطہ کی شکل میں نکلے گا، یعنی اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور لوگوں کو اس کی حالت پر رشک آنا، اس کے حساب کو قیامت کے دن دیکھ کر حق تعالیٰ شانہ کی رضامندی کا اعلان ہوگا، اور محشر کے لوگوں کو اس شخص پر رشک آئے گا کہ اے کاش! ہمارے ساتھ بھی یہ معاملہ کیا جاتا۔

اپنا محاسبہ نہ کرنے والوں کا انجام:

جو شخص ایسا ہوتا ہو کہ زندگی اس کو غافل کردے اور اس کی سیئات، برائیاں اس کو مشغول رکھیں، تو اس کا نتیجہ ندامت اور حسرت ہوگا، قیامت کے دن ایسا آدمی پشیمان ہوگا اور حسرت اٹھائے گا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

’’اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ وَاِنْ کُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ۔‘‘ (الزمر:۵۶)

ترجمہ:...... ’’ہائے افسوس اس پر جو میں نے کوتاہی کی اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں، تفریط کی، اور میں تو تھا ہنسی مذاق سمجھنے والوں میں سے (کہ قیامت کا حساب ہنسی کھیل ہے)۔‘‘

تو ایک بات تو یہ تحریر فرمائی اور دوسری بات یہ تحریر فرمائی کہ جس چیز کی تمہیں نصیحت کی جارہی ہے اس پر غور وفکر کیا کرو تاکہ جن چیزوں سے رکنا چاہیے تم ان سے رک سکو اور باز رہ سکو۔

محاسبہ اور نصیحت حاصل کرنا:

تو ایک ہے محاسبہ اور دوسرا ہے نصیحت حاصل کرنا۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا نامہ اعمال لے کر، اپنے عمل کے دفاتر لے کر پیش ہونا ہے اور اپنا حساب کروانا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے نفع ونقصان کا میزانیہ آج ہی لگالے۔

روز کے روز کا حساب:

اکابرؒ تو فرماتے ہیں کہ روز کا روز حساب لگاؤ، عشاءؑ کی نماز کے بعد جب لیٹنے لگو، تو تھوڑا سا وقت اس کے لئے مقرر کرو، صبح سے لے کر شام تک جو کچھ ہم نے کیا ہے، کتنے لمحات ہم پر گزرے ہیں اور ان لمحات کو ہم نے کس مصرف پر خرچ کیا؟ اچھے کام پر خرچ کیا ہے یا برے کام میں یا لایعنی کام میں؟ تین ہی شکلیں ہوسکتی ہیں، اگر اچھے کام میں خرچ کیا ہے تو شکر کرو اور کہو: ”اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔“ لیکن پھر یہ بھی سوچ لو کہ جو اچھے کام کئے ہیں، جیسے کرنے چاہئے تھے، ویسے ہی کئے ہیں؟ ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کی؟ کیونکہ حق تعالیٰ شانہ کی عبادت کا حق تو ادا نہیں ہوسکتا، اورحق تعالیٰ شانہ کی عبادت کا حق کس سے ادا ہوسکتا ہے؟ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا میں نے حق ادا کرنے کی کوشش بھی کی ہے یا نہیں؟ اگر کوشش کی ہے تو اس پر شکر بجا لاؤ، اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو پھر ان نیک اعمال بجالانے میں جتنی کوتاہیاں، لغزشیں اور غفلتیں ہوئی ہیں ان پر توبہ استغفار کرو۔ ایک ہی چیز پر شکر بھی ہے اور استغفار بھی ہے۔ شکر تو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان اوقات کو نیک

کام میں مشغول کردیا: ’’اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔‘‘

نیکی کی توفیق پر شکر:

ہمارے ایک بزرگ ہیں، جو بہت زیادہ اچھی قسم کی انگریزی جانتے ہیں، قادیانیت کے بارے میں انہوں نے میرے رسائل کا ترجمہ کیا ہے، اب بھی وہ اس کام میں مشغول رہتے ہیں، تھوڑا بہت کرتے رہتے ہیں، اور ان کے انگریزی ترجمہ کی ایک جلد چھپ چکی ہے، تین دن پہلے میرے پاس آئے تھے اور اتنا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے مجھے بہت ہی اچھے کام میں لگادیا، خالصتاً لوجہ اللہ وہ اس کام کو کرتے ہیں، کوئی معاوضہ نہیں، کوئی ستائش نہیں، ممنون تو مجھے ان کا ہونا چاہئے تھا، لیکن وہ اتنی ممنونیت کا اظہار کر رہے تھے کہ کچھ پوچھو نہیں۔ مالک کی طرف سے نیک کام کی توفیق مل جانا اور کسی اچھے کام میں ہمیں لگادینا یہ کوئی معمولی احسان نہیں، اللہ تعالیٰ کا تو اس پر شکر کرو، دوسرا یہ کہ ہمارے اس کام میں جتنی کوتاہیاں، لغزشیں اور غفلتیں ہوئی ہیں اور جیسا ہمیں کرنا چاہئے تھا، ویسا بن تو کیا پڑتا ہم نے کوشش بھی نہیں کی، اس پر استغفار کیا جائے، شیخ عطارؒ فرماتے ہیں:

بے گناہ نگزشت بدما ساعتے
اور بہ حضور دل نہ کردم طاعتے

ترجمہ:......’’بغیر گناہ کے ایک گھڑی بھی ہم پر نہیں گزری، دل کی حاضری کے ساتھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ایک بھی عبادت کی ہو۔‘‘

زندگی میں کوئی عبادت تو ایسی ہو.....:

زندگی میں ایک عبادت تو ایسی ہوتی جو میں نے دل کی حاضری کے ساتھ ادا کی ہوتی۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ خَرَجَتْ خَطَایَاهُ مِنْ جَسَدِهٖ حَتّٰی تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ اَظْفَارِهٖ۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۸)

ترجمہ:......”جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے، (وضو کو بھی عبادت سمجھ کر کرے کہ یا اللہ! میں ظاہر کو پاک کر رہا ہوں تو میرے باطن کو بھی پاک کردے، ایسا وضو کرے کہ پانی سے صرف ظاہری اعضأ پاک نہ ہوں، بلکہ اس کا باطن بھی پاک ہوجائے، دھل جائے) ایسے وضو کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وضو کرنے ہی سے اس کے سارے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔“

خیر یہ گفتگو دوسری طرف چل پڑے گی، میں تو دوسری حدیث سنا رہا تھا کہ:

”مَنْ تَوَضَّأَ وُضُوْئِیْ هٰذَا ثُمَّ یُصَلِّیْ رَکْعَتَیْنِ لَا یُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فِیْهِمَا بِشَیْءٍ غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۹)

ترجمہ:......”اچھی طرح وضو کرے، وضو کرنے کے بعد دو رکعت نماز پڑھے، اور ان دو رکعتوں میں اپنے نفس کے ساتھ باتیں نہ کرے، تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ان دو رکعتوں کی برکت سے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔“

دو رکعت پر جنت کا وجوب:

اور دوسری حدیث میں ہے کہ:

”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَا مِنْ

مُّسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّىْ رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ اِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔“

(مشکوٰۃ ص:۳۹)

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب مؤمن بندہ اچھی طرح وضو کرلیتا ہے پھر دو رکعت اس طرح پڑھتا ہے کہ اپنے دل اور اپنی ذات سے نماز کی طرف متوجہ ہے، اللہ تعالیٰ ان دو رکعت کی برکت سے جنت کے دروازے کھول دیتے ہیں۔“

اب سوچو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں کہ وضو کرے اور وضو کرکے دو رکعتیں ایسی پڑھے کہ اپنے نفس سے باتیں نہ کرے، بلکہ اللہ سے باتیں کرے، کیا کبھی ہم نے ایسی نماز پڑھی ہے؟

کبھی قصد بھی کیا؟

طالب علم، شیخ سے حدیث پڑ رہے تھے تو یہ حدیث آئی، طالب علم نے کہا کہ: حضرت! ایسی نماز کون پڑھ سکتا ہے؟ شیخ نے فرمایا کہ: کبھی قصد بھی کیا ہے؟ افسوس اس پر نہیں کہ تم پڑھ سکتے ہو یا نہیں؟ یا تم نے پڑھی ہے یا نہیں پڑھی؟ ماتم تو اس کا ہے کہ تم نے کبھی اس کا قصد بھی کیا کہ آج مجھے ایسی نماز پڑھنی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہوجائے۔ قصد تو کرو، تو شیخ عطارؒ فرماتے ہیں کہ دل کی حاضری کے ساتھ ایک بھی عبادت نہیں کی اس پر استغفار کرو۔ یا اللہ! ہم سے جو کوتاہی ہوئی ہے، آپ اپنی رحمت کے ساتھ اس کا تدارک فرمادیجئے۔

ایک بزرگ کی دعا:

ایک بزرگ دعا کررہے تھے اور فرمارہے تھے کہ:

"اِصْنَعْ بِنَا مَا اَنْتَ اَهْلُهُ، وَلَا تَصْنَعْ بِنَا مَا نَحْنُ اَهْلُهُ۔"

ترجمہ:...... "یا اللہ! ہمارے ساتھ وہ معاملہ کیجئے جو آپ کے شایانِ شان ہے، وہ معاملہ نہ کیجئے جس کے ہم لائق ہیں۔"

صفر کا تجزیہ کرکے بھی اگر کوئی صفر بن سکتا ہے، ہم تو وہ بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ہم جیسا معاملہ کریں گے تو پھر کیا بنے گا؟ ہم نے اپنی شان کے مطابق کیا، آپ اپنی شان کے مطابق کیجئے، ہم نے عمل کیا اپنی شان کے مطابق، اپنی اہلیت اور نالائقی کے مطابق، اور آپ اس پر رضا مرتب فرمایئے اور اس پر جزا عطا فرمایئے اپنے شایانِ شان! ہمیں نہ دیکھئے بلکہ اپنے کو دیکھئے۔ تو جب اپنی کوتاہی عمل پر توبہ و استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے مانگیں گے تو اس ندامت اور استغفار کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ ہماری اس کمی کو اپنی رحمت سے پورا فرمادیں گے۔

گناہوں کی گندگی:

اور اگر ہمارا وقت معصیت میں گزرا، نافرمانی میں گزرا، تو اس کے یہ معنی سمجھو کہ ہم نے سفید کپڑوں پر گندگی لگائی، صبح کو اٹھے تھے تو کپڑے سفید تھے، شام ہوئی تو جگہ جگہ بول براز کی گندگی اور نجاست کے داغ دھبے لگے ہوئے تھے، اور ہم سے بدبو آرہی ہے، اب اس کا علاج یہی ہے کہ جلدی سے صابن لو اور اس گندگی کو دھولو، سونے سے پہلے پہلے گناہوں کی گندگی کو اپنے دامن ایمان پر رہنے نہ دو، باقی نہ چھوڑو، کیونکہ سونا مرنے کے مشابہ ہے، سونے سے پہلے پہلے اپنے دامن ایمان کو صاف کرلو، داغ اور دھبوں کو دور کرلو اور ایک دو آنسو بھی ان آنکھوں سے نکل جائیں تو یہ گناہوں کے لئے ایسے ہی کام دیتے ہیں جیسے کہ تیزاب سے رنگ اتر جاتا ہے،

دھبے دور ہو جاتے ہیں۔

گناہوں کی گندگی سات سمندروں سے بھی نہیں جاتی:

اس لئے کہتے ہیں کہ گناہوں کی گندگی کو سات سمندر نہیں دھو سکتے، لیکن آنکھوں کے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکل آئے تو تمام گناہوں کی گندگی کو دھو ڈالتا ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ میں شاعری کر رہا ہوں، شاعری نہیں کر رہا، حقیقت بیان کر رہا ہوں۔

حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا قَالَتْ: قُلْتُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: حَسْبُکَ مِنْ صَفِیَّةَ کَذَا وَکَذَا، تَعْنِیْ قَصِیْرَة، فَقَالَ: تعنی قَصِیْرَةً۔ فَقَالَ: لَقَدْ قُلْتِ کَلِمَةً لَوْ مزج بِہَا الْبَحْرُ لَمزجته۔“ (مشکوٰۃ ۴۱۴)

ترجمہ:......”ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ ایک دفعہ حضرت صفیہؓ کے بارے میں میرے منہ سے نکل گیا کہ اتنی سی تو ہے، اور ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ اتنی سی ٹھگنی ہے، (یعنی ہاتھ کا ہی اشارہ کیا تھا اور صرف اتنا کہا تھا زبان سے کہ اتنی سی تو ہے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عائشہ تو نے ایسی بات کہی ہے کہ اس کی سیاہی کو (سات) سمندر بھی نہیں دھو سکتے۔“

شاعری نہیں کر رہا، صحیح بات کر رہا ہوں، گناہوں کی گندگی سمندر سے بھی دور نہیں ہو سکتی، ہاں آنکھوں کے پانی سے دور ہو سکتی ہے اور آنکھوں کا پانی نہ آئے تو اس کا بھی علاج فرما دیا کہ: ”اگر تم رو نہ سکو تو رونے والی شکل ہی بنا لو۔“ رونا تو بعض دفعہ اختیاری نہیں ہوتا، لیکن رونے والوں کی شکل بنا لینا تو مشکل نہیں ہے۔ اپنے

پورے دن کی زندگی کا جائزہ لو اور جائزہ لے کر ایک ایک عمل کے بارے میں اپنی نیکیوں کی بھی اور اپنے گناہوں کی بھی فہرست مرتب کرلو۔

کتنی بڑی دولت ضائع ہوگئی:

اور تیسری قسم وہ وقت ہے جو ہم نے لایعنی ضائع کیا، یعنی جس کا کوئی مصرف نہیں، ٹھیک ہے تم سے اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، نفس نے کہہ دیا تھا کیونکہ اس پر تمہاری کوئی پکڑ نہیں ہوگی، لیکن یہ تو سوچو کہ تم نے دولت کتنی ضائع کردی؟ اس پر حسرت تو ہونی چاہئے، اور اگر تضیع اوقات پر بھی کوئی حسرت نہیں ہوتی تو پھر ماتم کا مقام ہے کہ وقت جارہا ہے، گزر رہا ہے، بلکہ گزر چکا ہے اور ہم خالی کے خالی رہے، زیادہ نہیں پانچ منٹ یہ روزانہ کا مراقبہ کرلو، یہ ہے محاسبہ، اور اس کا تدارک کرلو کیونکہ ابھی تدارک کا وقت ہے۔

حاجی محمد شریفؒ کی دعا:

میں نے تمہیں حاجی محمد شریف صاحبؒ کا مقولہ سنایا تھا، وہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے، ملتان میں اسکول کے ماسٹر تھے اور حضرتؒ سے خلافت بھی ملی، اندازہ کرو کتنے نیک آدمی ہوں گے! اسکول ماسٹر ہیں اور حضرتؒ نے ان کو رگڑے کتنے دیئے؟ یہ ان کی سوانح عمری سے معلوم ہوسکتا ہے۔ ان کے ملفوظات میں میں نے پڑھا کہ میں تہجد کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ:

> ”یا اللہ! قیامت کے دن آپ میرا حساب لے کر یہی تو بتائیں گے کہ یہ مجرم ہے۔ یہی بتانا چاہیں گے نا کہ یہ مجرم ہے! یا اللہ میں اپنے مجرم ہونے کا ابھی اقرار کرتا ہوں، خود اقرار کرتا ہوں، جو آدمی خود مجرم ہو اور مجرم ہونے کا اقرار کرتا ہو، اس پر گواہوں کے لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لئے

عدالت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن آپ مجرم ثابت کریں گے انجام اتنا ہی ہوگا کہ مجھے دوزخ میں ڈالیں گے، اس لئے میں معافی کا طلب گار ہوں، آپ کے عذاب کا تحمل مجھ سے نہیں ہوسکے گا، معاف کردیجئے! میرا کام جرم کرنا اور آپ کا کام معافی دینا ہے، آپ معاف کردیجئے!''

روزانہ کے محاسبہ سے تلافی ہوجائے گی:

روزانہ اگر اس محاسبہ کی عادت ڈال لی جائے جبکہ کوئی تم پر ڈنڈا لے کر نہیں کھڑا اور کوئی تم پر پہرا نہیں دے رہا، ان شاءاللہ! بہت کچھ تدارک ہوجائے گا، یہ بکھرے ہوئے بیر دوبارہ جھولی میں ڈال سکتے ہو، یہ اجڑی ہوئی کھیتی دوبارہ لہلہا سکتی ہے، بشرطیکہ اس کا انتظام کرو۔

بددیانتوں کی وجہ:

حقوق العباد کے معاملہ میں جو بددیانتیاں ہو رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کے معاملے میں جو بے اعتدالیاں ہو رہی ہیں، یہ کیوں ہو رہی ہیں؟ اس لئے کہ اوپر سے نگرانی کرنے والا کوئی ہے نہیں، اور اندر بندوں نے اپنی نگرانی کرنا چھوڑ دی، اوپر تو حساب لینے والا ایک ہی دن حساب لے گا، تم مطمئن ہو اور بندوں کی نظر بے چاری کمزور ہے، وہ تمہاری خلوت تک کہاں پہنچے گی اور قانون کا ہاتھ اپاہج ہے تم جب چاہو اس کا پنجہ مروڑ ڈالو، وہ تمہارے دامن تک نہیں پہنچے گا، تم مطمئن ہو کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں نہیں پکڑ سکتی، ہم نے ایسی ترکیب سے جرم کیا ہے کہ نشان قدم بھی مٹا دیئے ہیں۔

لیاقت علی مرحوم کو بھرے جلسے میں قتل کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ اکبر خان کو بھی گولی ماردی گئی جو لیاقت علی خان مرحوم کا قاتل تھا، چلو جرم مٹ گیا۔ آج تک پتہ

نہیں چلا کہ لیاقت علی خان کا قاتل کون تھا؟ یہ پاکستان کا پہلا سیاسی قتل تھا جو کہ وزیراعظم کا قتل تھا، تم نے سمجھا کہ ہم نے ثبوت مٹا دیئے، ثبوت موجود ہیں، یوم الحساب آئے گا تو سارے ثبوت پیش کردیئے جائیں گے۔

ہم محاسبہ آخرت کو بھول گئے:

تو میں عرض کررہا تھا کہ آج دنیا میں جو فساد پیدا ہورہا ہے وہ اس لئے کہ ہم نے اپنا محاسبہ چھوڑ دیا ہے، اس لئے کہ یوم الحساب کو بھول گئے، یاد ہی نہیں رہا کہ حساب ہونے والا ہے، ایک ایک پائی کا، ایک ایک ذرہ کا حساب لیا جائے گا۔

ترمذی شریف کے حوالہ سے مشکوٰۃ میں روایت ہے:

”لَا تَزُوْلَ قَدَمَا ابْنَ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حَتّٰی یُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ۔ عَنْ عُمُرِهٖ فِیْمَا اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِیْمَا اَبْلَاهُ، وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَیْنَ اِکْتَسَبَهٗ وَفِیْمَا اَنْفَقَهٗ وَمَاذَا عَمِلَ فِیْمَا اِذَا عَلِمَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۴۳)

ترجمہ:......”بندے کے قدم اپنی جگہ سے ٹلیں گے نہیں جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ نہیں لیا جائے گا:

۱:......اپنی عمر کہاں برباد کی تھی؟

۲:......اپنی جوانی کہاں بوسیدہ کی؟

۳:......مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟

۴:......اور کہاں خرچ کیا تھا؟

۵:......عالم سے سوال ہوگا کہ جو علم سیکھا تھا کیا اس پر عمل بھی کیا تھا یا نہیں؟“

چھوٹا سوال مگر مشکل جواب:

حساب دو، دیکھنے میں بظاہر چھوٹا سا سوال ہے اس کو حل کرو، لیکن ذرا اس سوال کا جواب لکھنے بیٹھو تو تم کہو گے کہ یاد نہیں رہا، کمپیوٹر تم کو دے دیا جائے گا، جس میں تمہارا زندگی کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ تاکہ دیکھتے رہو اور لکھتے رہو۔

جوانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ وہ کہاں بوسیدہ کی تھی؟ ''اَلشَّبَابُ شُعبَۃٌ مِّنَ الْجُنُوْنِ'' ہے ناں! یہ جوان کسی کی نہیں سنتا، بڈھوں کی نہیں سنتا، عقل پر پردہ آجاتا ہے، اس لئے حافظؒ کہتے ہیں کہ:

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں نیک تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا

ترجمہ:...... ''برخوردار! نصیحت سن لو! کیونکہ سعادت مند بچے بوڑھوں کی نصیحت کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تر جانتے ہیں۔''

جوانی کی نعمت کی قدر کرو:

بڑوں کے تجربے سے فائدہ اٹھالو، ''من نکر دم شما حاضر بکنید'' مجھ سے نہ ہوسکا تم تو کرو۔ یہ جوانی اس قسم کی ہے کہ یہی زمانہ حقیقت میں کام کرنے اور کمانے کا ہے، بچپن کا زمانہ تو لاشعوری کا زمانہ ہے، اور بڑھاپے کا زمانہ میری طرح معذوری کا زمانہ ہے، یہی جوانی کا زمانہ ہے، اگر کمالات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسی جوانی کے زمانے میں حاصل کرسکتے ہو، اپنے کو غارت اور برباد کرنا چاہتے ہو تو بھی یہی زمانہ ہے، اس کے لئے موزوں ترین زمانہ ہے، بلندیوں پر جانا چاہتے ہو تو آسمان سے اوپر تک پہنچ جاؤ گے اور نیچے گرنا چاہتے ہو تو بہائم سے، درندوں اور چوپایوں سے بھی نیچے

جاسکتے ہو، اسی جوانی کے زمانے میں اگر نیک بننا چاہو تو فرشتے تم پر رشک کریں، اور رخ دوسری طرف کرلو تو شیطان تم سے پناہ مانگے۔ حالانکہ جوانی بھی زندگی ہی کا ایک حصہ ہے لیکن اس کے سوال کا پرچہ الگ دیا گیا ہے۔ ”وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ۔“ جوانی کے بارے میں سوال ہوگا کہ وہ کہاں بوسیدہ کردی تھی؟

مال سے متعلق سوال:

مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے لیا تھا؟ کہاں دیا تھا؟ حاصل کیسے کیا؟ خرچ کیسے کیا؟ یہ ایک سوال دو مستقل سوالوں کا مجموعہ ہے، ایک ایک پائی کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ کہاں سے لیا تھا، حلال سے یا حرام سے؟ احکام خداوندی کی رعایت رکھی تھی یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ خرچ کہاں کیا تھا؟ بال بچوں کے نفقہ پر خرچ کیا تھا تو بہت اچھا کیا، عزیز و اقارب کی خبر گیری پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، صلہ رحمی پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، غربا و مساکین کی مدد پر خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، خیر کے کاموں میں خرچ کیا، اللہ تعالیٰ کی رضا کے کاموں میں خرچ کیا تو بہت اچھا کیا، سبحان اللہ! ٹی وی پر خرچ کیا تھا؟ تو لعنت! ڈش انٹینا لگایا تھا؟ لعنت! دنیا بھر کی نجاست تم نے اپنے گھر میں ڈال لی، اس لئے پیسے دیئے تھے؟ اور جتنے گناہ کے کام ہیں، نام و نمود اور نمائش کے کام ہیں، ان پر خرچ کروگے تو قیامت کے دن پکڑے جاؤ گے۔

علم کے بارے میں سوال:

علم کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ جتنا علم دیا تھا اس پر عمل کتنا کیا؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نے علم حاصل ہی نہیں کیا، ماشاءاللہ! عمل کا سوال تو بعد میں ہوگا، ہم نے علم ہی نہیں لیا تو کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مہمل بھیجی تھی؟ اپنے نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فضول بھیجا تھا؟ ہدایت کے لئے بھیجا تھا ناں! تمہاری ہدایت کے لئے

بھیجا تھا، تم ہی بتاؤ کہ قرآن کریم جیسی کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے جلیل القدر نبی تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے اور تم نے یہ لاپرواہی کی اور کہا کہ ہم نے سیکھا ہی نہیں! چلو اتنا کہنے سے چھوٹ جاؤ گے؟

جاہل دُہرا مجرم ہے:

عالم بے عمل کی برائی نہ پوچھو! لیکن جو شخص علم ہی حاصل نہیں کرتا، اس کے دو جرم ہیں، ایک علم حاصل نہ کرنا، دوسرا عمل نہ کرنا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب اور ہدایت یہ بندوں کو حقوق انسانیت سکھانے کے لئے ہیں۔ حقوق انسانیت یعنی حقوق اللہ، حقوق العباد۔ تم نے وہ سیکھے ہی نہیں، مطلب یہ کہ انسانیت ہی نہیں سیکھی۔

فرضِ عین وکفایہ کی تعلیم:

اس لئے اکابرؒ فرماتے ہیں کہ پورے دین کا عالم بننا تو فرض نہیں ہے، یہ تو فرض کفایہ ہے، امت میں کچھ افراد ایسے رہنے چاہئیں کہ جو جب بھی ان سے مسئلہ پوچھا جائے وہ بتاسکیں، کسی بھی نوعیت کا مسئلہ ہو، غور وفکر کر کے بتاسکیں، لیکن میری ذات سے متعلق جتنے اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں اور جن کا مجھے روز مرہ سابقہ پیش آتا ہے ان کا سیکھنا فرضِ عین ہے، فرضِ عین! جیسا کہ نماز فرض ہے، روزہ فرض ہے، زکوٰۃ فرض ہے، حج فرض ہے، اسی طرح روز مرہ کے مسائل جو مجھے درپیش ہیں، ان کے بارے میں سیکھنا فرضِ عین ہے، اور یہ کچھ مشکل نہیں، تم کہو گے کہ اب ہمیں مولوی بنائے گا، نہیں! نہیں! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، تمہیں مولوی نہیں بنانے جارہے مگر اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ جو نیا مسئلہ پیش آئے، جس کا حکم تم کو معلوم نہ ہو، کسی اللہ کے بندے سے، محقق عالم سے پوچھ لیا کرو، بس اتنی سی بات ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں، مگر ہمارے بھائیوں کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ نماز بھی کبھی نہیں سیکھی اور نماز

تو نماز یہ اقامت جو کہتے ہیں ناں ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا الله'' یہ بھی کبھی نہیں سیکھی، اقامت کہنے کا شوق ہے، اذان کہنے کا شوق، لیکن اس کے الفاظ ہی کی مشق کر لیتے بھائی! اذان کہتے ہوئے ''اَنْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا الله'' کہتے ہو، اور ''اَنَّا مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ الله'' کہتے ہو، ان کی نماز سنو وہ بھی غلط، غلط الفاظ ادا کرنا کلمۂ کفر ہے، علمائ کہتے ہیں کہ ''اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ الله'' کا معنی یہ ہے کہ بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اور اگر ''اَنَّا'' کہو گے غلط پڑھو گے ''الف'' کھڑا کر کے یعنی ''اَنَّا'' پڑھو گے تو پھر معنی یہ بن جائیں گے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہم اللہ کے رسول ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی بن جاؤ گے، وہ بھی کہتا ہے کہ میں محمد رسول اللہ ہوں۔

وضو نہیں سیکھتے۔ ایک موقع پر میں نے نماز جنازہ پڑھائی، ایک آدمی مجھ سے لڑ پڑا کہ میاں جی! نمازِ جنازہ کی نیت بھی بتایا کرتے ہیں، تم نے بتائی نہیں، میں نے کہا جن کو نمازِ جنازہ کی نیت نہیں آتی وہ تشریف کیوں لائے تھے یہاں؟ انہوں نے زحمت کیوں فرمائی؟ مولوی عین اس وقت جبکہ جنازہ تیار ہو تم کو نمازِ جنازہ کی نیت بھی بتائے، اور مولوی تم لوگوں کو نمازِ جنازہ کا طریقہ بھی بتائے، تم کہاں تھے؟ مولوی سے پہلے مل نہیں سکتے تھے کہ ہمیں بتادو نمازِ جنازہ کیسے پڑھی جاتی ہے؟ کیونکہ کبھی کبھی ہمیں بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

اللہ کے بندو! اللہ کو دھوکا نہیں دے سکتے ہو، اپنے آپ کو کیوں دھوکا دیتے ہو؟ تو یہ میں نے محاسبہ کے بارے میں ذکر کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص اپنا محاسبہ کرتا رہے گا انشائ اللہ جب شدت اور سختی کا وقت آئے گا تو اس کا انجام رضائے الٰہی اور غبطہ نکلے گا، یہ شخص لوگوں کے لئے قابل رشک ہوگا، لوگ اس پر رشک کریں گے، قیامت کے دن اعلان کر دیا جائے گا کہ فلاں آدمی کامیاب ہے، اولین اور آخرین سب سنیں گے، اس کی

خوشی دیکھنے کے لائق ہوگی، اس کا رشک قابل دید ہوگا، حسرت سے نگاہیں اس کی طرف اٹھیں گی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بنادے، آمین!

اور جو شخص زندگی کے مشاغل میں مشغول رہا، غافل رہا، غفلت کی زندگی گزر رہی ہے، اور سیئات میں مبتلا اور مشغول رہا، کبھی پیچھے دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ پیچھے بھی دیکھ لیتے، گناہوں کی سڑک پر، اس کے راستے پر سرپٹ دوڑ رہا ہے، کوئی آواز دیتا ہے تو سنتا نہیں، کوئی بلاتا ہے تو بولتا نہیں اور یہ کہہ کر گزر جاتا ہے کہ:

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو!
تجھ کو پرائی کیا پڑی؟ اپنی نبیڑ تو!

بھائی! ہمیں کسی پرائی کی نہیں پڑی، توبہ توبہ توبہ! اپنی نبڑ جائے تو بہت ہے، لیکن تم تو یہ کہہ کر فارغ نہیں ہوجاؤ گے، تمہیں جو بلایا جارہا ہے، جو آوازیں دی جارہی ہیں، جو سمجھایا جارہا ہے، وہ تمہارے نفع کے لئے ہے، زاہد کا اپنا نفع نہیں ہے، یہ کہہ کر کہ اپنی نبیڑ تو، تم ہم سے تو فارغ ہوجاؤ گے، لیکن قیامت کے دن کیسے فراغت ہوگی؟ اس کا تو سوچ لو!

گناہ گار اور غافل کا انجامِ بد:

تو جو شخص زندگی بھر مصروفیات میں مصروف رہا، غافل رہا اور گناہوں کے راستے پر دوڑتا رہا، اس کو کبھی متوجہ الی اللہ ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی، جب اس کا انجام نکلے گا تو نہایت ندامت اور حسرت کا انجام ہوگا۔ تم جانتے نہیں ہو کہ جتنی شراب تیز ہوتی ہے اتنا بدمستی زیادہ ہوتی ہے، لیکن جب نشہ ٹوٹتا ہے تو اعضا شکنی بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے، پھر اٹھ نہیں سکتا، معاصی اور غفلت کی شراب میں اتنے بدمست نہ ہوجاؤ کہ قیامت کے دن پھر اٹھا نہ جاسکے، اعضا شکنی تمہیں چلنے نہ دے۔

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو تم کو نصیحت

کی جارہی ہے، اس پر غور کرو، تاکہ جس چیز سے رکنا چاہئے آج تم باز رہ سکو تاکہ کل قیامت کے دن تم کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔“

لزومِ حق سے حق کی راہ نمائی:

اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق کو لازم پکڑو گے تو وہ تمہارے سامنے حق کو واضح کرے گا، حق خود واضح کرے گا اپنے آپ کو، اور جب تمہارے سامنے حق آجائے گا اور تم حق کو لازم پکڑلو گے تو اہل حق کے منازل اور مراتب تمہارے سامنے آجائیں گے، اس لئے کوئی فیصلہ حق کے خلاف نہ کرو، اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نصیحت فرمائی تھی کہ:

”یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی ....الخ۔“

(ص:۲۶)

ترجمہ:......”اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کا فیصلہ کیا کرو، خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔“

اللہ کی شان! بات دیکھو کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو فرما رہے ہیں کہ خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، نبی کا نفس کیا ہوگا اور اس کی خواہش کیا ہوگی؟ جب نبی کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو، تو میرے اور آپ کے لئے کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ ہمیں بصیرت عطا فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

موت کے وقت کے احوال

مرنے کے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوتا ہے، میں کہتا ہوں مرنے کے وقت جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان ہے، آدمی کا اچھا یا برا ہونا اس وقت اس کو معلوم ہوجاتا ہے، اور اس کے اعمال کی جزا و سزا اسی وقت شروع ہوجاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

''حضرت کا ایک وعظ آج سے کئی سال قبل ہفت روزہ ختم نبوت میں شائع ہوا تھا، جو موت اور موت کے بعد پیش آنے والے احوال کی حقیقی عکاسی پر مبنی ہے، وہ بحوالہ ختم نبوت شامل اشاعت ہے۔''

جتنے ہم نے ظلم کئے ہیں، جتنی لوگوں پر زیادتیاں کی ہیں، جتنے گناہ کئے ہیں، وہ موت کے وقت ہمارے سامنے متمثل ہوجائیں گے، سامنے آکر کھڑے ہوجائیں گے، اور پھر شیطان اس وقت اپنا پورا زور لگاتا ہے کہ ان کا ایمان ختم ہوجائے، اس کو کافر کرکے مارا جائے، بندوں کے گناہوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

ترجمہ:......''شیطان کہتا ہے کہ آدم کی اولاد نے میری کمر توڑ ڈالی ہے، بڑی مشقت کے ساتھ اور بڑی محنت کے ساتھ میں ان کو گناہوں کی طرف بلاتا ہوں اور ان سے گناہ

کرواتا ہوں اور جب بندہ گناہ کرلیتا ہے تو اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور ندامت کے ساتھ کہتا ہے: یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میں گناہگار ہوں، میں تیرا قصوروار ہوں، مجھے اپنی رحمت سے معاف فرمادے! اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلیتے ہیں اور فرماتے ہیں: چلو معاف کیا! اس طرح شیطان کی ساری محنت رائیگاں گئی۔"

نزع کے وقت شیطان کا مکر:

لیکن مرنے کے وقت وہ کوشش کرتا ہے کہ آدمی کو یہ یقین دلائے کہ تیری بخشش نہیں ہوسکتی، تو اتنا بڑا گناہگار ہے کہ تیری بخشش ناممکن ہے، اس طرح اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس کرکے اس کا ایمان سلب کرلے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ:

حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ہے کہ وہ نزع کی حالت میں تھے، غشی ہوتی پھر افاقہ ہوجاتا، پھر غشی ہوتی پھر افاقہ ہوتا، اور غشی کی حالت میں کہتے: "لا اذًا، لا اذًا۔" (نہیں! ابھی نہیں، نہیں! ابھی نہیں) آپ کے صاحبزادے صالح سرہانے پر کھڑے تھے، جب حضرت امامؒ کو ہوش آیا تو صالح کہنے لگے: ابا جی! آپ کیا کہہ رہے تھے؟ یہ عجیب لفظ بول رہے تھے "ابھی نہیں! ابھی نہیں!" فرمایا کہ: سامنے ابلیس کھڑا ہے اور اس طرح دانتوں میں انگلی دبائی ہوئی ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ: "احمد ہائے افسوس! احمد تو مجھ سے بچ کے جارہا ہے۔" تو میں اس کے جواب میں کہہ رہا تھا کہ: "ابھی نہیں! ابھی نہیں!" ابھی چند سانسیں باقی ہیں، پتہ نہیں ان چند سانسوں میں کیا ہوتا ہے؟

حضرت جنیدؒ کا واقعہ:

حضرت جنید بغدادیؒ نزع کی حالت میں تھے، قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے، لوگوں نے کہا کہ حضرت ساری عمر تلاوت کی ہے، ہمت نہیں، طاقت نہیں، اب تو اپنے اوپر رحم کیجئے! فرمایا: تمہارا ناس ہوجائے اس وقت سے زیادہ میں کسی وقت بھی محتاج نہیں تھا، خاتمہ بالخیر ہوجانا بہت بڑی دولت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے معاف رکھیں کہ کسی کا خاتمہ برا ہو۔ بس یہیں سب کچھ فیصلہ ہوجاتا ہے، پہلی منزل تو نزع ہے، مرنے کو تو سارے ہی مرتے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیسے مرا؟ اور کیا لے کر مرا ہے؟

ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ حضرت! دعا فرمادیجئے اللہ تعالیٰ گناہ سے حفاظت فرمائے، تو فرمایا: تم گناہ کو روتے ہو، یہاں ایمان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، گناہ کی تو معافی ہوجائے گی، خدانخواستہ اگر ایمان ہی جاتا رہا تو پھر کیا ہوگا؟

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ کے غضب کو کھینچنے والی ظلم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔''

ظالم کے لئے یہ وقت بڑا مشکل وقت ہوتا ہے، اور ظالم کس کو کہتے ہیں؟ ظالم کون ہوتا ہے؟ کسی سے بے انصافی کرنے والا! کسی کے حقوق جو ہمارے ذمہ لازم ہیں اور ہم نے اس کا حق ادا نہ کیا تو یہ ظلم ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ترجمہ:......''ظلم قیامت کے دن ظلمتیں بن جائیں گی، ہر طرف اندھیرا، چارسو اندھیرا، کدھر جائیں؟ کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہوگا۔''

ہماری غفلت کا عالم:

ہم اپنی زندگی گزارتے ہوئے اگلے مراحل سے بالکل غافل اور بے پروا ہوجاتے ہیں، کافروں کی طرح شاید اب ہمارا بھی یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ بس زندگی تو یہی زندگی ہے کہ مرتے ہیں اور جیتے ہیں، اور آگے کیا ہے؟ اس کا کچھ کچھ خیال بھی آتا ہے،لیکن یقین نہیں، یہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کا قول نقل کیا ہے: ’’اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ۔‘‘ جبکہ مؤمن کی یہ شان نہیں، مؤمن کا اگلی زندگی پر، پیش آنے والے اچھے اور برے حالات پر ایسا یقین ہے جیسا کہ آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیز پر ہوتا ہے، اللہ کے بندے بے پرواہ ہوکرنہیں چلتے، ان کو پتہ ہے کہ مرنا ہے۔

موت آخرت کی پہلی منزل:

مرنے کے بعد جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہوتا ہے، میں کہتا ہوں مرنے کے وقت جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان ہے، آدمی کا اچھا یا برا ہونا اس وقت اس کو معلوم ہوجاتا ہے، اور اس کے اعمال کی جزا وسزا اسی وقت شروع ہوجاتی ہے۔

نیک لوگوں کی موت کی کیفیت:

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ:

حضرت عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت فرشتوں کی جماعت کے ساتھ جب قبض روح کے لئے مرنے والے کے پاس آتے ہیں، اگر وہ نیک آدمی ہوتا ہے تو سورج کی طرح نہایت چمکتے ہوئے نورانی چہروں اور حسین شکل میں آتے ہیں، ان کے وجود سے خوشبوئیں آتی ہیں، مرنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت دیر کا دوست بچھڑا ہوا آج ملا ہے، اس کو سلام کہتے ہیں، نہایت پیار کے ساتھ اس کی روح قبض کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عزرائیل علیہ السلام سے کہا تھا کہ: عزرائیل! میری امت کے ساتھ سختی نہ کیجیو! کہا کہ: یا رسول اللہ! آپ کی امت کے نیک لوگوں کے لئے میں ان کے والدین سے زیادہ شفیق ہوجاتا ہوں، چنانچہ ان کے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو نہایت نورانی چہرے اور نورانی لباس میں ہوتے ہیں، وہ آکر اس کا احاطہ کرلیتے ہیں اور حضرت عزرائیل علیہ السلام میت کے سرہانے پہنچ کر کہتے ہیں کہ اے ایمان والی اور اطمینان والی روح! اللہ کی رحمت اور رضوان کی طرف نکل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عزرائیل کا یہ لفظ سن کر روح ایسے نکل جاتی ہے جیسے مشکیزے سے قطرہ ٹپک جاتا ہے، گویا ملک الموت کے پیارے الفاظ سن کر روح نکلنے کے لئے ایسی بے تاب ہوجاتی ہے کہ جیسے کوئی پرندہ پنجرے کا دروازہ کھولتے وقت بے چین ہوتا ہے کہ جلدی سے کھول دو، گویا یہ روح ایک بند پنجرہ میں تھی اور ایک مبارک فرشتہ آیا ہے جو پنجرہ کھول رہا ہے، روح نکلنے کے لئے بے تاب ہوجاتی ہے، پھر روح نکلی اور فوراً رحمت کے فرشتوں نے اپنے ہاتھوں میں لیا، ایک لمحہ بھی حضرت عزرائیل علیہ السلام کے پاس نہیں چھوڑتے، جنت سے کفن ساتھ لے کر آتے ہیں، ہم تو اس جسم کو اور اس دھڑ کو کفن پہناتے ہیں، لیکن روح کا کفن فرشتے جنت سے لے کر آتے ہیں، ایسا معطر اور ایسا خوشبودار کفن کہ روئے زمین کی کوئی کستوری اس کا مقابلہ نہیں کرتی، اس روح کو اس میں لپیٹ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں، راستے میں فرشتوں کی جماعتیں ملتی ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کون مبارک بندہ ہے؟ کون پاکیزہ روح ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں بن فلاں ہیں، دنیا میں جو اس کے بہترین القابات تھے ان کے ساتھ اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ روح پہلے آسمان پر جاتی ہے تو وہاں کے مقرب فرشتے اس کی مشایعت کرتے ہیں، اسی طرح ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں (یہاں تک کہ اس کو بارگاہ الٰہی میں باریابی ہوتی ہے، گویا روح بارگاہ الٰہی میں سجدہ کرتی ہے،

آج تک غائبانہ سجدہ کرتے تھے، آج وہ وقت آیا کہ جیسا سجدہ کرنا چاہئے تھا ویسے سجدہ کیا جائے)، حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں: میرے بندے کو علّیین میں لکھ دو اور نیک ارواح کا جو مستقر ہے اس میں پہنچادو۔

برے آدمی کی موت کی کیفیت:

اور جب برا آدمی مرتا ہے تو عزرائیل علیہ السلام نہایت ڈراؤنی شکل میں آتے ہیں، ایسی ڈراؤنی شکل کہ اللہ کی پناہ! اور ان کے ساتھ ڈراؤنی شکل کے فرشتے ہوتے ہیں اور ان کے پاس دوزخ کا بدبودار کفن ہوتا ہے، حضرت عزرائیل علیہ السلام اس کو ڈانٹ کر کہتے ہیں کہ اے خبیث روح! نکل اپنے رب کے غضب کی طرف! نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی اس جھڑکی کو سن کر روح بجائے نکلنے کے بے تاب ہوکر بدن کے روئیں روئیں میں سرایت کرجاتی ہے جیسا کسی پرندے کو پکڑنا چاہتے ہیں اور وہ چھپنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن بھلا اس کو چھپنے کون دیتا ہے؟ اب اتنی سختی اور شدت اس میں ہوتی ہے جیسے لوہے کی سیخ گیلی پشم پر مار کر اس کو کھینچا جائے، اس کو بھی اس طرح سختی کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ یہ چونکہ نزع کا عالم ہوتا ہے اور نزع کے معنی کھینچنے کے ہیں اور جب اس کی روح نکال لی جاتی ہے تو رواں رواں زخمی ہوجاتا ہے، روح نکالنے کے بعد اس کو فوراً عذاب کے فرشتے لے لیتے ہیں اور اسے گندے اور بدبودار ٹاٹ میں لپیٹتے ہیں وہ اتنا گندہ اور بدبودار ہوتا ہے کہ روئے زمین پر اتنا بدبودار کوئی مردار نہیں، اب فرشتے اس کو لے کر اوپر جاتے ہیں تو جہاں سے وہ گزرتے ہیں، راستے میں جتنے فرشتے ملتے ہیں اس کی گندگی سے ناک بند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: لعنت ہو اس پر، کون خبیث روح ہے؟ لے جانے والے فرشتے بتاتے ہیں کہ فلاں بن فلاں ہے، فرشتے اس کے لئے بددعا کرتے ہیں، جہاں جہاں سے گزرتا ہے اس کی روح اپنا تعفن

پھیلاتی جاتی ہے، اور جب فرشتے اس کو لے کر اوپر آسمان تک پہنچتے ہیں تو اس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھلتے، بند کر دیئے جاتے ہیں، اور حکم ہوتا ہے کہ اس کو سب سے نچلی زمین میں ''سجین'' میں پھینک دو، چنانچہ وہیں سے پھینک دیتے ہیں۔

نزع کی حالت کا خلاصہ:

یہ میں نے تھوڑا سا نقشہ ذکر کیا ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ یہ موت کا مرحلہ مجھے بھی درپیش ہے اور آپ کے سامنے بھی پیش آنے والا ہے، اور یہ بات میں آپ کے سامنے بار بار کہہ رہا ہوں کہ جیسی ہم نے زندگی گزاری ہے، اسی کے مطابق مرتے وقت ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے گا، نیک لوگوں کے ساتھ ان کے مطابق، اور بروں کے ساتھ ان کے مطابق۔ پھر نیک لوگوں کے بھی مختلف درجات ہیں، اسی طرح برے لوگوں کے بھی بے شمار درجات ہیں، کافروں کے بھی بے شمار درجات ہیں، ہر ایک شخص کے ساتھ اس کے درجہ کے مطابق معاملہ کیا جائے گا۔ ہمارا زندگی گزارنا ایسا ہونا چاہئے کہ نزع کا وقت، موت کا وقت ہمارے لئے اللہ کی رحمت کا وقت ہو، اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا وقت ہو، اللہ کے غضب اور عذاب کا وقت نہ ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرماتے تھے:

''اَللّٰھُمَّ اجعَلْ خَیرَ عُمُرِیْ اٰخِرَہٗ، وَخَیرَ عَمَلِیْ خَوَاتِیمَہٗ، وَخَیرَ اَیَّامِیْ یَومَ اَلْقَاکَ فِیہِ۔''

ترجمہ:......''یا اللہ! میری عمر کے آخری حصہ کو سب سے بہتر حصہ بنا دے، یا اللہ! میرے اعمال میں سب سے اچھا عمل وہ ہو جس پر میرا خاتمہ ہو، یا اللہ! میرے دنوں میں سب

سے بہترین دن وہ ہو جس دن میں آپ سے ملاقات کروں (یعنی جس میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور پیش کیا جاؤں، وہ دن میری زندگی کا سب سے بہترین دن ہو)۔"

اللہ تعالیٰ اس دعا کو ہم سب کے حق میں قبول فرمائیں۔

اللہ کے مقبول بندوں کے لئے موت کا دن عید کا دن ہے:

اللہ کے مقبول بندوں کے لئے موت کا دن گویا ان کے لئے عید کا دن ہے، شادی کا دن ہے کہ اس سے زیادہ خوشی اور مسرت کا دن ان پر کبھی نہیں آیا، اور بدکاروں اور گناہگاروں کے لئے موت کا دن سب سے برا دن اور سب سے زیادہ بربادی کا دن ہے کہ اس سے زیادہ برا دن ان پر کبھی نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ اس مرحلے کو ہمارے لئے اپنی رحمت سے آسان فرمائے اور ہمیں اس وقت کے لئے تیاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسری منزل قبر ہے:

خدا خدا کرکے یہ مرحلہ گزرا، اب دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کر یہ جارہا ہے، لیکن جاننے والے جان رہے ہیں کہ دوزخ کی طرف جارہا ہے یا جنت کی طرف جارہا ہے۔

میت کو جلدی دفنانے کی تاکید:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اس کے کفن دفن میں جلدی کرو، کیونکہ اگر وہ نیک ہوگا تو تم اس کو خیر کی طرف جلدی سے بھیج دو، تم نے اس کو یہاں کیوں مقید کر رکھا ہے؟ کیوں یہاں پھنسایا ہوا ہے؟ اور اگر برا ہے تو اس مردار کو کیوں رکھا ہوا ہے؟ اس لئے حکم ہے کہ جتنی جلد ہوسکے اس کی تجہیز و تکفین فوراً کردو۔

تدفین میں تاخیر کرنے کی بری رسم:

ہمارے یہاں بہت برا رواج ہے کہ میت کو اٹکائے رکھتے ہیں، کہتے ہیں کہ میت کو روکے رکھو، کیونکہ اس کے عزیز و اقارب اس کا منہ دیکھنے کے لئے انگلینڈ سے آرہے ہیں، دبئی سے آرہے ہیں، لاہور سے آرہے ہیں، فلاں جگہ سے آرہے ہیں، فلاں جگہ سے آرہے ہیں، گویا ان عزیز و اقارب نے آج سے پہلے کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ اور ایک اس سے بدتر رسم یہ ہے کہ کسی شخص کا انگلینڈ میں، امریکہ میں انتقال ہوا، اس کی میت کو پاکستان لانے کے انتظامات ہو رہے ہیں اور اس میں بعض اوقات کئی کئی دن لگ جاتے ہیں، یہ تمام چیزیں خلاف شرع ہیں۔

اب اس کے بعد میت کو قبر میں پہنچا دیا اور قبر کو اوپر سے بند کردیا گیا، بعض بے وقوف قبر پکی بناتے ہیں، اور بعض قمقمے لگاتے ہیں، بعض قبر پر تختی لگاتے ہیں اور اس پر قبر والے کے القاب و آداب لکھتے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ ان باتوں کا کیا فائدہ؟ اس کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے وہ تو اندر ہو رہا ہے، اندر کتنی تاریکی ہے؟ اندر کتنا اندھیرا ہے؟ اس کا تو کوئی علاج کرو، اوپر سے دیئے جلانے کا کیا فائدہ؟ اکبر الٰہ آبادی کے بقول:

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے!
تہِ خاک ہم تو اکیلے رہیں گے!

(ہفت روزہ ختم نبوت کراچی ج:۱۵ ش:۱۱)

شاہراہ انسانیت کی روشن قندیلیں

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دست سوال دراز کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا کردیا، میں نے دوبارہ سوال کیا، پھر عطا فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا: ''اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز، دل فریب اور شیریں ہے، جو شخص اس کو سیر چشمی کے ساتھ لے اس کے لئے تو اس مال میں برکت ہوگی، اور جو نفس کی حرص وطمع (اشراف نفس) کے ساتھ لے، اس کے لئے مال میں کبھی برکت نہ ہوگی اور اس کی حالت جوع البقر کے اس مریض کی ہے جو کھاتا جائے، مگر پیٹ نہ بھرے اور اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا) بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے (یعنی لینے والے سے)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضانِ نبوت سے رشد وہدایت کی جو شمعیں روشن ہوئیں اور صاحب خلق عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی اقتداً سے جن سعادت مندوں کے قلب وقالب پر صبغۃ اللہ کا رنگ چڑھا، ان کا وجود سراپا خیر و برکت، ان کی زندگی انسانیت کے لئے مایۂ فخر اور ان کا نقش پا قافلہ انسانیت کے لئے نشان منزل ہے۔ ان اکابر نے ایثار وقربانی، ہمدردی وخیر خواہی، صبر وشکر، زہد وقناعت، ورع وتقویٰ اور اعلیٰ انسانی اقدار کا جو بلند معیار قائم کیا اسے ''شاہراہِ انسانیت کی روشن قندیلیں'' کہئے تو بجا ہے اور ملت مسلمہ کے لئے مینارۂ نور کہئے تو درست ہے۔

ان مقبولانِ بارگاہِ خداوندی کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے اور ان کے حالات وواقعات ان کی صحبت کا بدل ہیں اور ان کی صحبت بارگاہ قدس میں حاضری، بقول عارف رومی قدس سرہ:

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا
گو نشیند در حضورِ اولیاؔ

وفا ومروّت:

مولانا غلام علی آزاد رحمہ اللہ، میر سید طیب رحمہ اللہ کے حالات میں لکھتے ہیں: شیخ عبدالحق (محدث) دہلوی قدس سرہ اور حضرت میر طیب رحمہ اللہ کے مابین بڑا گہرا دوستانہ تعلق تھا، شیخ عبدالقدس قدس سرہ برعایت بزرگی انہیں، ''شیخ طیب'' کہا کرتے تھے، شیخ عبدالحق قدس سرہ پیرانہ سالی کے زمانے میں کسی کتاب کا درس دے رہے تھے کہ کسی مقام میں شیخ کو تأمل ہوا، شیخ نے حضرت میر رحمہ اللہ کو یاد کرکے فرمایا: ''اگر شیخ طیب اس وقت موجود ہوتے تو اس مقام کو آسانی سے حل کردیتے''۔ادھر شیخ کے منہ سے یہ بات نکلی اور ادھر حضرت میر طیب رحمہ اللہ جو وطن مالوف (بلگرام) سے بقصد دہلی تشریف لارہے تھے، کمر بستہ شیخ کی خدمت میں پہنچ گئے، شیخ بہت خوش ہوئے، انہیں خوش آمدید کہی اور فرمایا: ''ہم تو آپ کو یاد ہی کررہے تھے''۔ قصہ بیان فرمایا، کتاب پیش کی گئی، حضرت میر سید طیب رحمہ اللہ نے کتاب ہاتھ میں لے کر قدرے تامل کیا اور پھر ''عبارت رانہج خواند کہ مطلب بے آنکہ تقریر کنند خود بخود واضح گشت''۔عبارت اس انداز سے پڑھی کہ مطلب بغیر تقریر کے آپ سے آپ واضح ہوگیا۔

شیخ نے فرط مسرت میں حاضرین سے فرمایا: ''دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ شیخ طیب اس مقام کو باآسانی حل کرسکتے ہیں۔

مولانا آزاد رحمہ اللہ آگے لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالحق کے صاحب زادے شیخ نور الحق ان دنوں بادشاہ وقت کے اصرار سے دارالحکومت آگرہ میں منصب قضا پر فائز تھے، شیخ عبدالحق رحمہ اللہ نے میر سید طیب رحمہ اللہ سے دریافت کیا: ''کس راستے سے آنا ہوا؟''، ''آگرہ کے راستے سے!''، ''نور الحق سے بھی ملاقات ہوئی؟''، ''جی

نہیں! موانع سفر سے ملاقات کا موقع نہ مل سکا"۔

ظاہر ہے کہ میر سید رحمہ اللہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے۔

شیخ نے فرمایا: "بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ وہ قضا کا مرتکب ہے، اس لئے اعراض فرمایا گیا، بعد ازاں شیخ نے فرزند ارجمند کی شان میں کچھ توصیفی کلمات فرمائے کہ وہ اگرچہ میرا بیٹا ہے مگر ہے باپ کی جگہ، اگرچہ میرا شاگرد ہے، مگر بجائے استاذ کے ہے، اور اگرچہ میرا مرید ہے مگر بمنزلہ مرشد کے سمجھتا ہوں"۔

میر سید رحمہ اللہ نے اس دوستانہ شکوہ کا کیا اثر لیا؟ وہ خود مولانا آزاد بلگرامی رحمہ اللہ کی زبان سے سنئے:

"میر سید طیب رحمہ اللہ از پیش شیخ برکاست بعونانے کہ گویا برائے کمر واکردن میں رود، اطلاع شیخ ہما طور کمر بستہ بہ رجع القہقہری گرفت وبا شیخ نورالحق ملاقات کردہ برگشت۔

شیخ عبدالحق از حسن خلق میر خیلے خوشنود گرچہ معذرتہا برزبان آورد"۔ (مآثر الکرام ص:۲٦)

ترجمہ:...... "میر سید طیب رحمہ اللہ شیخ کے پاس ایسے اٹھے گویا کمر جو باندھ رکھی تھی، اسے کھولنے جارہے ہیں اور شیخ کو اطلاع کئے بغیر اسی طرح بندھی بندھائی الٹے پاؤں آگرہ کی راہ لی نورالحق سے ملاقات کرکے واپس آئے۔

شیخ عبدالحق رحمہ اللہ حضرت میر رحمہ اللہ کے حسن خلق سے بہت خوش ہوئے اور دیر تک معذرت کرتے رہے"۔

گھر کی بات بازار میں:

انہی میر سید طیب قدس سرہ کے تذکرہ میں مولانا غلام علی آزاد رحمہ اللہ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک دن ایک بزرگ، میر سید رحمہ اللہ کی مشتاقانہ زیارت کو آئے، دوران گفتگو ''مشکلے از مسائل توحید پرسید''۔(مسائل توحید کا کوئی نازک مسئلہ پوچھ بیٹھے) مگر حضرت میر رحمہ اللہ طرح دے گئے اور باندازِ تجاہل فرمایا: ''مجھے اس مسئلے کی خبر نہیں''۔ اور اس امر کی مطلق پروا نہیں کی کہ لوگوں کے حسنِ عقیدت کو ٹھیس پہنچے گی۔ یا کوتاہ علمی کا یہ اعتراف لوگوں کی نظر سے انہیں گرادے گا۔ بہرحال مجلس ختم ہوئی اور خلوت میسر آئی تو حضرت میر رحمہ اللہ نے مہمان سائل سے فرمایا: ''گھر کی بات بازار میں نہیں کہا کرتے، ہاں اب پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' (مآثر الکرام،ص:۴۶)

اشراف نفس:

مولانا غلام علی آزاد رحمۃ اللہ علیہ، میر مبارک محدث بلگرامی قدس سرہ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''استاذ المحققین میر طفیل محمد بلگرامی طاب ثراہ فرماتے تھے کہ ایک روز حضرت میر (سید مبارک رحمہ اللہ) کی خدمت میں باریاب ہوا، وضو کے ارادے سے اٹھے تھے کہ اچانک زمین پر گر گئے۔ میں اٹھ کر پاس گیا کچھ دیر کے بعد افاقہ ہوا تو میں نے سبب دریافت کیا، تو بتانے سے گریز فرمایا بالآخر بڑے اصرار کے بعد فرمایا کہ تین دن سے کسی قسم کی کوئی غذا حلق سے نیچے نہیں اتری۔ ان تین دنوں میں نہ کسی سے اس فاقہ کا اظہار کیا نہ قرض لیا۔ مجھ پر بڑی رقت طاری ہوئی، وہاں سے فوراً اپنے مکان پر پہنچا اور نہایت عمدہ کھانا جو حضرت رحمہ اللہ کو

مرغوب تھا، تیار کیا اور لے کر حاضر خدمت ہوا، پہلے تو بہت ہی مسرت وبشاشت کا اظہار فرمایا اور بڑی دعائیں دیں بعد ازاں فرمایا: ’’اگر تمہیں انگوار نہ ہو وایک بات کہوں؟‘‘ عرض کیا ضرور۔

فرمایا: ’’ایسے کھانے کا نام فقراً کی اصطلاح میں ’’طعام اشراف‘‘ ہے، ہر چند کہ فقہاء کے نزدیک اس کا کھانا جائز ہے اور شریعت میں تین دن کے بعد تو مردار بھی حلال ہے، مگر طریقہ فقرأ میں ’’طعام اشراف‘‘ کا کھانا جائز نہیں‘‘۔

میں نے حجرت کا یہ ارشاد سنا تو بغیر کسی ردوقدح اور چون وچرا کے وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھانا اٹھا کر باہر لے آیا، تھوڑی دیر توقف کے بعد کھانا لے کر پھر حاضر ہوگیا اور عرض کیا کہ جب بندہ اس کھانے کو اٹھا کر لے گیا تھا، تو کیا حضرت کو یہ توقع تھی کہ دوبارہ واپس لائے گا؟ فرمایا: نہیں! عرض کیا: اب تو یہ حضرت کی توقع کے بغیر آیا ہے اس لئے ’’طعام اشراف‘‘ نہیں رہا۔ حضرت میر رحمہ اللہ اس تاویل سے بہت محفوظ ہوئے اور فرمایا کہ: تم نے عجیب فراست سے کام لیا، چنانچہ اس کھانے کو بہ رغبت تمام تناول فرمایا‘‘۔ (مآثر الکرام،ص:۸۸،۸۹)

فائدہ......’’اشراف‘‘ کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر سے جھانک کر دیکھنا، اور جب کسی چیز کے حصول کو دل للچائے، یہا کسی شخص سے کسی چیز کے حاصل ہونے کی توقع ہو تو اس کو ’’اشراف نفس‘‘ کہتے ہیں، اور یہ اصطلاح مندرجہ ذیل احادیث سے لی گئی ہے:

’’عن حکیم بن حزام قال: سألت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فاعطانی، ثم سألتہ فاعطانی، ثم

قال لی: یا حکیم! ان ھذا المال خضر حلو، فمن اخذہٗ بسخاوۃ نفسٍ بورک لہٗ فیہ، ومن اخذہٗ باشراف نفسٍ لم یبارک لہٗ فیہ، وکان کالذی یأکل ولا یشبع، والید العلیا خیر من الید السفلیٰ۔ قال حکیم: فقلت: یا رسول اللہ!والذی بعثک بالھق! لا ازرأ احدًا بعدک شیئاً حتیٰ اُفارق الدنیا۔ مفق علیہ۔" (مشکوٰۃ،ص:۱۶۲)

ترجمہ:...... "حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دست سوال دراز کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مال عطا کردیا، میں نے دوبارہ سوال کیا، پھر عطا فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا: "اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز، دل فریب اور شیریں ہے، جو شخص اس کو سیر چشمی کے ساتھ لے اس کے لئے تو اس مال میں برکت ہوگی، اور جو نفس کی حرص وطمع (اشراف نفس) کے ساتھ لے، اس کے لئے مال میں کبھی برکت نہ ہوگی اور اس کی حالت جوع البقر کے اس مریض کی ہے جو کھاتا جائے، مگر پیٹ نہ بھرے اور اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا) بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے (یعنی لینے والے سے)۔"

ایک اور حدیث حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"عن عمر بن الخطاب قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطینی العطاء فاقول اعطہ افقر الیہ منی! فقال: خذہ فتمولہ وتصدق بہ، فما جائک من ھذا المال وانت غیر مشرف ولا سائل فخذہٗ، ومالا

تتبعهُ نفسک۔ متفق علیه۔‘‘ (مشکوٰۃ،ص:۱۶۲)

ترجمہ:......’’آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجھے مال کا کچھ عطیہ دیتے، تو میں عرض کرتا کہ کسی ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا حرج ہے، اس کو لے لو، اپنے پاس رکھو اور صدقہ خیرات کرو۔(بعد ازاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصولی ضابطہ بیان فرمایا کہ) جو مال بغیر طمع نفس اور سوال کے تیرے پاس آجائے اس کو لے لیا کرو اور جو اس شرط پر پورا نہ اترے، اس کے پیچھے رال نہ ٹپکاؤ۔‘‘

ان احادیث میں تصریح فرمائی گئی ہے کہ جس طرح بغیر ضرورت واضطرار کے سوال کرنا جائز نہیں، اسی طرح کسی کی چیز پر نظر رکھنا، اس کے حصول حرص اور طمع رکھنا بھی ناپسندیدہ ہے اور اس طرح جو مال حاصل ہو، وہ کبھی خیر وبرکت کا موجب نہیں ہوتا، اس سے نفس کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کی جوع البقر میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ الغرض شریعت میں زبان کا سوال جس طرح ناجائز ہے، اسی طرح دل کا دال بھی مکروہ ہے، اسی کو’’اشراف نفس‘‘ کہتے ہیں، جس سے بچنے کا اہل اللہ کے یہاں خاص اہتمام ہے۔

ایک پیسہ اور دو کام:

میر سید مبارک محدث بلگرامی قدس سرہ ہی کا ایک اور واقعہ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ موصوف نے اپنے قدیم محلہ’’سید واڑہ‘‘ سے ترک سکونت کرکے شہر کی مشرقی جانب ایک میدان میں سکونت اختیار کرلی تھی، وہاں رعایا آباد کی، مسجد بنوائی، رہائشی مکانات بنوائے اور چوروں اور درندوں سے حفاظت

کے لئے آباد کے گرد پختہ دیوار بنوائی۔ اس بستی میں بیشتر نور بافوں کو آباد کیا، کیونکہ وہ اکثر ویندار اور نمازی ہوتے ہیں، اور تمام آباد کاروں کے لئے قانون مقرر کردیا کہ پنجگانہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کیا کریں۔ ایک جولا ہے نے عذر کیا کہ میں پنج وقتہ حاضری سے معذور ہوں، میر رحمۃ اللہ علیہ نے وجہ دریافت کی تو جولاہا بولا: جتنی دیر نماز کو جاتا ہوں، کام میں حرج ہوتا ہے اور اجرت میں نقصان۔ حضرت میرررحمہ اللہ نے پوچھا کہ روزانہ نماز کے وقت کام بند رہنے سے کتنی کمی واقع ہوجاتی ہے؟ جواب دیا کہ ایک پیسہ! حضرت میر رحمہ اللہ ننے فرمایا: ایک پیسہ ہم سے لے لیا کرو مگر نماز پڑھا کرو، اس نے قبول کرلیا۔

ایک روز یہ جولاہا مسجد میں آیا اور وضو کئے بغیر نماز میں کھڑا ہوگیا، حضرت میر رحمہ اللہ نے ڈانٹا کہ بغیر وضو کے نماز پڑھتے ہو؟ جواب دیا ایک پیسے میں دو کام نہیں ہوسکتے کہ وضو بھی کروں اور نماز بھی پڑھوں، حضرت رحمہ اللہ کع بے اختیار ہنسی آئی اور وضو کے لئے مزید ایک پیسے کا اضافہ فرمادیا۔

دعوت وتبلیغ کا ایک اہم اصول:

یہ تو خیر ایک لطیفہ ہوا، مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ مولانا آزاد رحمہ اللہ نے آگے لکھا ہے:

”رفتہ رفتہ حائک را رغبت دلی درنماز بہم رسید، واز تقضائے اجرت درگزشت“۔ (مآثر الکرام،ص:۹۷)

یعنی وہ مسکین جولاہا جو نماز کے علاوہ وضو کے لئے الگ پیسے کا مطالبہ کرتا تھا، رفتہ رفتہ ظاہر کا اثر اس کے باطن پر ہوا، نماز اس کے قالب سے قلب تک پہنچ گئی، اور جو نماز صرف ایک پیسے کے لالچ میں پڑھی جارہی تھی وہی بالآخر دلی رغبت کے ساتھ ادا ہونے لگی، اور یوں ں اس کے اجرومزدوری کا معاملہ بجائے میر صاحب کے براہ راست اس ذات عالی سے طے ہوگیا جس کی نماز پڑھانا مقصود تھی۔

بظاہر جو نماز ایک پیسے کے بدلے پڑھی پڑھائی گئی وہ ایک پیسے کی بھی نہیں تھی لیکن شروع ہی سے اسے یہ مسئلہ سمجھایا جاتا تو بعید نہیں وہ تمام عمر نماز سے محروم رہتا، مگر حضرت میر قدس سرہ نے حکیمانہ بتدریج سے اسے نماز کا عادی بنادیا۔ اس تدریجی حکومت سے کم ہمتوں کی ہمت بڑھانا اور بے راہوں کو راہ پر ڈالنا اسوۂ نبوت ہے۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ بنوثقیف کا وفد بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا تو انہوں نے اسلام لانے کے لئے یہ شرط رکھی کہ نہ تو انہیں کبھی جہاد کے لئے بلایا جائے گا، نہ ان سے زکوٰۃ وعشر لیا جائے گا اور نہ انہیں نماز پڑھنے کے لئے کہا جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہیں جہاد وعشر کی معافی دی جاتی ہے، رہی نماز تو اس کی معافی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس دین میں ذرا بھی خیر نہیں جس میں نماز نہ ہو:

”فانه لا خير في دين لاركوع فيه۔“

دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد وعشر کی معافی کی شرط پر ان کا اسلام قبول فرمایا، مگر ساتھ ہی فرمایا کہ یہ لوگ اسلام لے آئیں تو خودبخود صدقہ بھی ادا کریں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (ابوداؤد،ص:۴۶۸)

مولانا بدر عالم نور اللہ مرقدہ پہلی روایت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

> ”امام موصوف (خطابی) کا خیال ہے کہ جہاد اور زکوٰۃ کا استثناء بھی یہاں صرف سورتاً تھا، کیونکہ جہاد ہمیشہ فرض نہیں ہوتا، زکوٰۃ بھی نصاب اور حوالان حول پر موقوف ہوتی ہے، اس لئے سردست ان کو ان دونوں سے سبکدوش کیا جاسکتا تھا، رہی نماز تو وہ ایک ایسی عبادت تھی جسے دن میں پانچ بار ادا کرنا ہر شخص پر فرض ہے، اس کا استثناء کسی کے حق میں گوارا نہیں کیا جاسکتا، نیز اس وفد بنوثقیف کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین

حاصل ہوچکا تھا کہ آئندہ چل کر وہ اپنے شوق سے صدقہ بھی کریں گے اور جہاد بھی کریں گے، ایسی صورت مُں ان کے ساتھ لفظی مناقشہ کرنا غیر مناسب تھا۔''

(معالم السنن، ج:۳، ص:۳۵)

اور دوسری روایت کے تحت لکھتے ہیں:

''اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کے لئے اصل مقاصد کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اور لفظی مناقشات کرنا نا مناسب ہے، بعض مرتبہ صرف لفظی گرفتوں سے اصل مقاصد ہی فوت ہوجاتے ہیں۔'' (ترجمان السنہ، ج:۲، ص:۴۰)

اسی نوعیت کی ایک اور حدیث ابو داؤد، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں بالفاظ مختلفہ مروی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت فضالہ لیثی رضی اللہ عنہ بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوکر مشرف با اسلام ہوئے، آنجرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نماز، روزہ اور شرائع اسلام کی تعلیم فرمائی اور نماز پنجگانہ کی محافظت کا حکم فرمایا، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں ان اوقات میں کچھ زیادہ ہی مشغول ہوتا ہوں، بس کوئی جامع مات، جو کافی وشافی ہو، مجھے بتادیجئے! فرمایا: بہت اچھا! ''عصرین'' کی پابندی کیا کرو۔ یہ لفظ انہوں نے پہلی بار سنا تھا، عرضض کیا: یا رسول اللہ! ''عصرین'' سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: سورج نکلنے سے پہلے کی نماز اور سورج ڈوبنے سے پہلے کی نماز۔

(ابو داؤد، ص:۱، ترجمان السنہ، ص:۴۶)

اس حدیث پر اشکال کیا گیا ہے کہ پانچ نمازوں کے بجائے ان صاحب کو فجر اور عصر کی پابندی کا حکم کیسے فرمایا؟ علماء نے اس حدیث پر متعدد پہلوؤں سے کلام کیا ہے، مگر سب سے آسان بات وہی ہے جو اوپر عرض کی گئی، یعنی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تدریجی حکمت کو اس میں ملحوظ رکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب

انہیں پنج وقتہ نماز کی نگہداشت کا حکم فرمایا اور انہوں نے ان اوقات میں اپنی شدید مصروفیت کا عذر کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ مصروفیت کی بنا پر کبھی دیر سویر ہوگئی تو وعدہ شکنی ہوگی، اس لئے کوئی ایسی جامع بات بتایئے جس کو پورے طور پر نبھا سکوں اور وعدہ خلافی نہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بگڑ کر کہتا کہ بندہ خدا! ایسی مصروفیت کون سی ہے جو نماز سے زیادہ اہم ہو؟ مگر نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فدا ہوں) ان کے اس عذر پر جرح کرنا خلافِ حکمت سمجھا، اور اس کے بجائے انہیں ”عصری“ کی پابندی کا حکم فرمایا، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان دو نمازوں کو اگر ٹھیک وقت پر مسجد میں باجماعت ادا کرنے کا التزام کرلیا جائے ۰اسی کو محافظت کہتے ہیں) تو باقی تین نمازوں کی محافظت کچھ بھی مشکل نہیں رہتی، گویا ”عصرین“ کی پابندی کا حکم بجائے خود پنج وقتہ کی پابندی کی تمہید یا اس کا پہلا زینہ تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نومسلم کو جو ابھی چند لمحے پہلے اسلام سے آشنا ہوا، اسی تدریجی سیڑھی کے ذریعہ اسلام کی آخری بلندی اور اس کی انتہائی معراج تک لے جانا چاہتے تھے۔

(ہفت روزہ ختم نبوت کراچی، ج:۱۵،ش:۱۹)

اصلاحی مواعظ (۸ جلدیں) ایک نظر میں

جلد اول

مقصد حیات دنیا نہیں۔۔ آخرت
محبت رسول ﷺ
لیلۃ القدر کی برکات
فضائل اعتکاف
عظمت قرآن
توبہ کیسے کریں؟
حسد کا علاج
غیبت ایک اخلاقی برائی
دنیا کی حقیقت
صبر کے درجات

جلد دوم

حضرت آدم علیہ السلام کا تذکرہ
انسان پر گزرنے والے ادوار
روضہ اقدس پر حاضری
شب برات ۔۔ ایک تحقیقی جائزہ
صبر و شکر
زبان کی حفاظت
بہترین تاجر کی علامت
خوف خدا اور فکر آخرت
قبر کی تیاری ضروری ہے
مقام بندگی اور دعاء کی حقیقت

جلد سوم

آنحضرت ﷺ کا ذریعہ معاش
موذن کے فضائل
اعتکاف کے آداب
رجال آخرت
تبلیغ والوں کے لئے ہدایات
شیعان علی اور حضرات اہل بیت
غصہ کے اسباب اور اس کا علاج
حج کے انعامات
غدار کی سزا
جواہر پارے

جلد چہارم

حضورؐ کے سفر حج کی تفصیلات
فضیلت شیخینؓ
حضرت عمرؓ کی چھ نصیحتیں
حضرت علیؓ کی شہادت
دو بڑے بد بخت
شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی چند دعائیں
ریاکاری اور اخلاص
۱۲ ربیع الاول اور اس کے تقاضے
مدرسہ کے چار بنیادی اصول
اللہ کی نعمتوں کا استحضار

جلد پنجم

بڑوں کے بعد چھوٹوں کی ذمہ داری
جذبہ ایثار، حکمت و دانائی
حضرت ابو درداءؓ کی پانچ نصیحتیں
عورتوں کا فتنہ
بدعت کی حقیقت
قرآن سیکھ کر پڑھنے کے فضائل
صوفیاء کے اخلاق
شہادت کی فضیلت اور اقسام
موت کے وقت کے احوال
شاہراہ انسانیت کی روشن قندیلیں

جلد ششم

قرابت نبوی ﷺ کا فائدہ
مہاجرینؓ و انصارؓ کی فضیلت
خواجہ معین الدین چشتیؒ
آداب تعلیم و تربیت
جھگڑے کے اسباب
صبر، تمام مسائل کا علاج ہے
جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک
ظلم و ستم اور حرص کے نقصانات
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا
عذاب الٰہی سے بچاؤ کی صورت

جلد ہفتم

معرفت الٰہی
صحابہؓ کا ایمان سیکھنا
اوقات نماز کی حکمتیں
آخرت کی تیاری
تین طلاق کا حکم
زندگی کے مراحل
مسجد کی تعمیر و آبادی کا ذوق
مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک
حرام اشیاء کی خرید و فروخت

جلد ہشتم

سنت کے مطابق نماز پڑھنا
نماز ۔۔ مناجات الٰہی کا نام
اللہ تعالی کی وحدانیت
نیک لوگوں کی صحبت
عبدیت کاملہ
امت میں اختلاف کا سبب
جدید تعلیم کے نتائج
بغیر علم کے مسئلہ بتانا
گیارہویں شریف
تعلق مع اللہ اور تصوف